یکم و ۱۶ جون ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۱۱۔۱۲

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمد ذوالحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

فیصلہ کُن قدم مُسلم دُنیا ہی کو اُٹھانا ہے!

ایم ابراہیم خان

ایسا بہت کچھ ہو رہا ہے جو انتہائی حیرت انگیز بھی ہے اور پریشان کن بھی۔ ہزاروں سال کا علمی اور فنی سفر اب اُس منزل میں ہے جس کے بارے میں انسان صرف سوچتا آیا تھا یا جس کے لیے صرف خواب دیکھنے کی گنجائش تھی۔ جو کچھ بھی سوچا تھا، وہ اب حقیقت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کے لیے انسان جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ حاصل کر چکا ہے۔

ابھی نصف صدی پہلے تک کی دنیا میں جو کچھ تھا، وہ اب صرف یادوں کا حصہ ہے۔ بہت کوشش کرنے پر بھی یاد نہیں آتا کہ جب یہ سب کچھ نہیں تھا یعنی انٹرنیٹ کی سہولت میسر نہ تھی، کمپیوٹرز نے اِتنی ترقی نہیں کی تھی اور انسان ٹیکنالوجی پر بہت زیادہ منحصر نہیں رہتا تھا، تب زندگی کس طور بسر ہوتی تھی۔ وہ زندگی آج ہمارے حافظے سے نکل چکی ہے۔ یہ بہت عجیب بات ہے مگر عمومی سطح پر ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔

آج کی جدید ٹیکنالوجی سے مزیّن دنیا ہمارے سامنے ہی نہیں ہے بلکہ ہم اُس کا حصہ ہیں۔ اور معاملہ یہ ہے کہ جتنے ہم دنیا کے ہیں، اُتنی ہی یا اُس سے کچھ زیادہ ہی دنیا ہماری ہے۔ آج کے انسان کا ذہن انتہائی نوعیت کی پیچیدگیوں کا مرقّع ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طور جیا جائے۔ زندگی بسر کرنا بھی اب ایک باضابطہ فن کا سا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ ذہنی الجھنیں اِتنی زیادہ ہیں اور نفسی ساخت میں پائی جانے والی گرہیں اِس قدر ہیں کہ اب نفسیاتی اُمور کے ماہرین زندگی بسر کرنے کا فن سِکھانے کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ کوئی فی سبیل اللہ والا معاملہ نہیں بلکہ اِس سے ایک پوری صنعت ہے جس سے لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے۔

کیا ہم نے سوچا تھا کہ کبھی ایسا بھی وقت آئے گا؟ ذہنوں میں تو بہت کچھ تھا۔ آنکھوں میں بسے ہوئے خواب بہت کچھ بیان کرتے تھے اور انسان اُن کی بنیاد پر اپنے ذہن میں ایک خاکہ سا ضرور بناتا تھا کہ آنے والی دنیا ایسی ہوگی، ویسی ہوگی مگر پھر بھی بہت زیادہ سوچنے کی گنجائش پیدا نہیں ہو پاتی تھی اور انسان ایک خاص حد تک ہی اندازہ لگا پاتا تھا کہ مستقبل کی نوعیت کیا ہوگی، زندگی کس ڈگر پر گامزن ہوگی۔

جو کچھ قصوں کہانیوں میں پایا جاتا تھا، وہ آج حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ جن سہولتوں کا صرف خواب دیکھا جا سکتا تھا، وہ آج ہماری زندگی کا حصہ ہیں اور حصہ بھی اِس طور ہیں کہ ہمیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ آج ہم وہاں کھڑے ہیں جسے انسان کے لیے فطری علوم و فنون کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے اور یہ ایسی بات ہے جسے کہتے وقت تردید کا خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا۔ انسان نے ہزاروں سال کے عمل میں جو کچھ سیکھا اور سوچا تھا، وہ آج ایک مقام پر یکجا ہو چکا ہے۔ مختلف ادوار کی پیشرفت ایک پلیٹ فارم پر ہے اور وہ پلیٹ فارم ہے ہر انسان کی زندگی۔ بہت کچھ ہے جو کھو گیا ہے مگر اُس کا بڑا حصہ اخلاقی و تہذیبی اقدار کی صورت میں ہے۔ انسان کی روح زخمی ہے، مضمحل ہے مگر مادّی سطح پر تو اِتنا کچھ حاصل ہو چکا ہے اور یقینی بنایا جا چکا ہے کہ ہم اِس حوالے سے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ زندگی کو آسان بنانے کے لیے جتنی بھی سہولتوں کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا، وہ سب کی سب آج ہماری زندگی کا حصہ ہیں، ہمیں اِس طور میسر ہیں کہ ہم جس قدر چاہیں، استفادہ کر سکتے ہیں اور کر ہی تو رہے ہیں۔

کس نے سوچا تھا کہ کبھی انسان چوبیس گھنٹے بھی رابطے میں رہ سکے گا؟ کس کے وہم و گمان میں تھا کہ پہلے سیٹلائٹ ٹی وی اور بعد میں انٹرنیٹ کے ذریعے ہر انسان پوری دنیا کو جب چاہے دیکھ سکے گا، جو چاہے گا سُن سکے گا، پڑھ سکے گا؟ یہ سب کچھ بدیہی طور پر تو خواب کا سماں لگتا ہے۔ اور کیوں نہ لگے؟ یہ سب کچھ اپنی اصل میں ہے ہی اِس قدر خواب آگیں کہ ہم محض سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اور کسی بھی معاملے کا سِرا ہاتھ نہیں آتا۔

ترقی کا ثمرہ

فطری علوم و فنون میں ہر پہلو سے اِس قدر ترقی ممکن بنائی جا چکی ہے کہ اب مزید کچھ کرنے کی گنجائش تلاش کرنا بھی ایک فن کا درجہ رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں دن رات یہ سوچا جا رہا ہے کہ اب مزید کیا کریں کہ جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ واقعی کچھ کیا جا رہا ہے۔ تحقیق کا بازار کم و بیش پانچ صدیوں تک گرم رہا ہے اور تحقیق کی یہ گرم بازاری ایسی ہے کہ بہت سوچنے پر بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک دور تھا جب

اندرونی صفحات پر

- ٹرمپ اسرائیلی جارحیت روکنے میں ناکام؟
- بھارت: ۴۷ کروڑ محنت کشوں کی داستانِ اَلم
- ایک افریقی سیاسی راک اسٹار کی تقریر
- افغانستان، پہاڑوں کے سائے میں ایک دنیا
- شاہراہِ زوال کا راہی
- یورپ خطے کو جنگ میں جھونک رہا ہے!

رابطہ آسان نہ تھا، دوسروں تک رسائی بہت دشوار ہوا کرتی تھی۔ تب الگ الگ خطوں میں ایک ہی چیز پر کام ہو رہا تھا اور بعد میں پتا چلتا تھا کہ بیک وقت کئی ماہرین نے ایک ہی معاملے پر اپنا وقت صَرف کیا۔ اب ایسا نہیں ہے مگر اب مصیبت یہ ہے کہ یہ سمجھنا اور طے کرنا بھی بجائے خود ایک دردِ سر ہے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ تحقیق کے میدان میں بہت کچھ ہو رہا ہے مگر اُس کا بیشتر حصہ اپنی اصل میں مکھی پر مکھی بٹھانے جیسے معاملے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ بعض معاملات میں بہت شور مچایا جارہا ہے مگر عملاً کچھ بھی نہیں ہو پا رہا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ لہو گرم رکھنا مقصود ہے۔ آج کے انسان کا ایک بڑا یا بنیادی مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ اب کیا ایجاد کیا جائے۔ ایجاد کی گنجائش زیادہ نہیں رہی، اِس لیے اختراع کی دنیا آباد ہے۔ علم و فن کے میدان میں یہ انوکھی دکان داری ہے۔ اب بہت سی چیزوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا عمل زور پکڑ چکا ہے۔ اِسے آپ بہت حد تک ''سنگیولیرٹی'' کہہ سکتے ہیں۔ اسمارٹ فون ہی کو لیجیے۔ اِس میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب کا سب الگ الگ بھی میسر ہے۔ ٹیکنالوجی کی بدولت پیدا ہونے والی مہارت اور سہولت نے بیسیوں ایجادات کے ثمر کو یکجا کر دیا ہے، ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے۔ اسمارٹ فون کے ذریعے فلم بنانا اور دیکھنا، آواز ریکارڈ کرنا اور سُننا، انفرادی اور اجتماعی ٹیلی فون کام کرنا، تصویر کھینچنا، کسی چیز کو اسکین کرنا اور دوسرے بہت سے کام ممکن بنائے گئے ہیں۔ اسمارٹ میں وقت دیکھا جاسکتا ہے، ہزاروں سال کا کلینڈر اور دوسری بہت سی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ یہ سب کچھ نیا نہیں ہے، پہلے سے موجود ہے۔ ہاں، اسمارٹ فون میں اِن تمام سہولتوں کو یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ انسان ضرورت کے مطابق فوری طور پر مستفید ہو سکے۔ اور ہو رہا ہے۔

مادّی علوم و فنون میں پیشرفت، ترقی اور خوشحالی ممکن بنانے کی راہ اللہ نے سب کے لیے رکھی ہے۔ جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے، اُن کے لیے بھی یہ راستہ کھلا ہے کہ جب چاہیں چلیں اور اپنی مُرادوں کی منزل تک پہنچیں۔

جن اقوام نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مادّی ترقی کی ہے، اُنہوں نے اِس ترقی کی بنیاد پر حاصل ہونے والی طاقت کے ذریعے دوسری ریاستوں اور خطوں کو بھی متاثر کرنے اور زیرِ نگیں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب کچھ بہت حد تک فطری ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ کسی کو اِس دنیا میں ترقی سے نوازتا ہے تو وہ اُس دنیا کے لیے بھی کچھ جمع کرتا ہے یا نہیں۔ تاریخ کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف خطوں اور ریاستوں نے دنیا پر راج کیا ہے۔ مسلمانوں کے حصے میں کئی ادوار آئے ہیں۔ کبھی اسپین پر آٹھ سو سال حکومت کی اور ہندوستان کو بھی کم و بیش آٹھ سو سال تک زیرِ نگیں رکھا۔ ترکیہ بھی سپر پاور رہا ہے۔ اُس نے ایشیا اور یورپ، دونوں خطوں کے بڑے حصے پر راج کیا اور اپنے آپ کو خوب منوایا۔

اب پانچ صدیوں سے کم و بیش ۸۰ فیصد دنیا پر مغرب کا راج رہا ہے۔ مغرب یعنی شمالی امریکا اور یورپ۔ شمالی امریکا میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے علاوہ میکسیکو، پانامہ اور کینیڈا بھی نمایاں ہیں۔ یورپ جہالت اور پسماندگی کا ایک طویل دور گزارنے کے بعد جب بیدار ہوا تو اُس نے روشن خیالی کی راہ پر گامزن ہو کر دنیا کو مسخر کرنے کا سوچا۔ اُس نے فطری علوم و فنون میں انتہائی نوعیت کی پیشرفت یقینی بنانے کا سفر چودھویں صدی میں شروع کیا تھا جو اَب تک جاری ہے۔ مختلف خِطّوں اور اقوام نے مادّی ترقی میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زرّیں اَدوار میں دنیا کو بہت کچھ دیا۔ اور مغرب کے اہلِ علم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آج ہمیں مغرب میں جو شاندار ترقی دکھائی دے رہی ہے، اُس کی بنیاد درحقیقت مسلمانوں ہی نے رکھی تھی اور اہلِ یورپ نے مسلمانوں ہی سے بہت کچھ اَخذ کر کے مادّی ترقی کو حیران کُن حد تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا۔ یورپ نے تین صدیوں تک کئی دُور افتادہ خِطّوں پر حکومت کی۔ یہ سب کچھ مادّی ترقی سے حاصل ہونے والی طاقت کی بنیاد پر تھا۔ اِس دوران یورپ نے مظالم کا بازار بھی گرم رکھا۔ جن خطوں کو اُس نے فتح کیا، وہاں کے لوگوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے اور اُنہیں سَر اُٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔

مغرب نے ناکوں چنے چبوائے ہیں

امریکا اور یورپ نے مل کر کم و بیش سو سال تک دنیا کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ تین صدیوں تک یورپ کی اُٹھان کے بعد امریکا بیدار ہوا اور پھر اُس نے یورپ کے ساتھ مل کر باقی دنیا کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے کا ڈول ڈالا۔ بیسویں صدی کی آمد تک امریکا غیر معمولی قوّت کا حامل ہو چکا تھا۔ اُس کی معیشت بہت مضبوط تھی۔ اُس دَور کی جدید ترین ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاتے ہوئے امریکا اور یورپ نے دفاعی ساز و سامان اور دیگر متعلقہ اشیا کی تیاری اور فروغ کے لیے جامع منصوبہ سازی کی اور اِس کا پھل بھی کھایا۔ امریکا اور یورپ نے مل کر باقی دنیا کے لیے رول ماڈل کی حیثیت اختیار کی۔ فطری علوم و فنون میں حیرت انگیز پیشرفت نے امریکا اور یورپ کو باقی دنیا سے بہت الگ رکھا اور انفرادیت کے قیام میں مدد دی۔ دنیا سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ یہ دونوں خِطّے اِس قدر ترقی یافتہ کیوں ہیں اور اِن کا شاندار اور قابلِ رشک لائف اسٹائل کیونکر ممکن ہو سکا ہے۔ کئی عشروں تک دنیا سحر زدہ رہی۔ پہلے یورپ کے سامنے اور پھر امریکا کے سامنے ماتھا ٹیکنے والے سامنے آئے۔ یورپ نے تین صدیوں کے دوران افریقا، ایشیا اور دیگر خطوں میں بہت سے ممالک کو فتح کر کے اپنی کالونی یعنی نوآبادی میں تبدیل کیا۔ نوآبادی یعنی غلام علاقہ۔ یورپی طاقتوں میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور ہالینڈ بہت نمایاں رہے جنہوں نے دُور افتادہ خطوں میں عسکری مہم جُوئی کے ذریعے اپنی دھاک بٹھائی اور نوآبادیاں قائم کیں۔ استعماریت نے ترقی کا ایسا دور شروع کیا جس میں حقیقی معنوں میں پیشرفت اور بلندی صرف مغربی طاقتوں کے لیے تھی اور باقی دنیا کے لیے صرف پسماندگی اور ہزیمت۔ امریکا اور یورپ نے مل کر کم و بیش دو صدیوں کے دوران اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ کوئی بھی خِطّہ اُٹھ نہ سکے، پنپ نہ سکے۔ اس کی واضح ترین مثال افریقا ہے جسے مغربی دنیا نے کم و بیش چار صدیوں سے انتہائی پسماندگی کی دلدل میں دھکیل رکھا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں افریقی ممالک کو مغربی طاقتوں نے نام نہاد آزادی تو دی، تاہم ڈھنگ سے جینے کا حق اُن سے چھین لیا۔

امریکا اور یورپ کی بالادستی اِس نوعیت کی رہی ہے کہ دنیا بھر میں غلامانہ ذہنیت پنپتی گئی ہے۔ یورپ نے بالادستی کا طویل دور گزارا ہے۔ اُس کے عروج کو دیکھتے ہوئے امریکا نے بھی زور پکڑا اور انیسویں صدی کے دوسری نصف میں اُس کی طاقت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ یہ اضافہ مادّی ترقی کی بدولت ممکن ہو سکا۔ فطری علوم و فنون کو زندگی کی بنیاد بنا کر زندگی بسر کرنے کا ڈھب امریکیوں نے بھی سیکھنے میں دیر نہیں لگائی۔ ''بے خدا کائنات'' کا تصور یورپ نے امریکیوں کو دیا۔ امریکا میں بھی یورپ ہی کے لوگ آباد تھے۔ ذہنی، فکری اور نظریاتی ہم آہنگی قائم ہونے میں دیر نہیں لگی۔ خدا کے وجود اور مذہب سے مکمل بیزار یورپ کی طرح امریکا نے بھی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ کر اِسے بھرپور طور پر گلے لگانے کی روش اپنائی۔ کہنے کو امریکی مذہبی رہے مگر یہ معاملہ برائے نام تھا۔ امریکیوں نے بہت جلد لبرل سوچ اپنائی اور ایک ایسے ماحول کو دنیا کے سامنے لانے کی تگ و دَو میں لگ گئے جس میں کسی خدا اور اُس کی تعلیمات کے لیے گنجائش برائے نام تھی۔

دَہریت کا فروغ

امریکا اور یورپ نے مل کر ۸۰ فیصد دنیا کو عملاً زیرِ نگیں ہی نہیں رکھا بلکہ دَہریت کو بھی فروغ دیا۔ روشن خیالی کے نام پر دنیا کو مذہب سے بیزار اور کائنات کے کسی خالق ورب کے تصور سے عاری کرنے میں امریکا اور یورپ دونوں ہی کا برابر کا کردار رہا ہے۔ یورپ نے کلیسا سے نجات پانے کے بعد بھرپور مادّی ترقی ممکن بنائی تھی، اِس لیے وہاں یہ تصور پروان چڑھا کہ یہ کائنات اپنے طور پر معرضِ وجود میں آئی ہے اور اپنے طور پر ہی چل رہا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کے دور کے بیشتر یورپی مفکرین نے ماحول سے مذہب کو الگ کرنے بلکہ نکال پھینکنے کی بھرپور کوشش کی اور ایسی زندگی بسر کی جسے دیکھ کر لوگوں نے سیکھا کہ کائنات خود بخود چل رہی ہے اور اِسے چلانے والا، ہمارے گناہوں پر گرفت کرنے والا اور اچھے اعمال کا اچھا صلہ دینے والا کوئی خدا موجود نہیں۔

دَہریت کے خلاف واحد مزاحمت

بے مثال مادّی ترقی کی بدولت حاصل ہونے والی طاقت کے ذریعے امریکا اور یورپ نے دنیا کو مذہب سے بیزار اور لاتعلق کرنے پر بہت زور دیا۔ یہ بھی منافقت کی انتہا تھی۔ جو مغرب کہتا ہے کہ کوئی خدا نہیں اور کسی مذہب یا اُس کی تعلیمات کی ضرورت نہیں، اُسی مغرب نے مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے والی ہزیمت کو اب تک نہیں بھلایا اور اب بھی صلیبی جنگوں کا بدلہ لینے پر بضد دکھائی دیتا ہے۔ یورپ کے لوگ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں اور مذہب کی بنیاد پر منافرت اور تقسیم در تقسیم یقینی بنانے والوں کے خلاف محاذ قائم ہونا چاہیے اور دوسری طرف یہ لوگ اب تک مسلمانوں کے خلاف ہیں اور اپنے اپنے ایجنڈے کے مطابق مسلمانوں پر مظالم ڈھاتے رہے ہیں۔ عرب دنیا کو کس بنیاد پر تباہ حال اور منقسم رکھا گیا ہے؟ امریکا اور یورپ نے مل کر عرب سمیت بیشتر مسلم ریاستوں کو بربادی سے دوچار کیا ہے۔ یہ سب کچھ اُسی مذہب کے نام پر ہے جس سے اہلِ مغرب برأت کا اظہار کرتے نہیں تھکتے اور یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش ہیں کہ وہ تو برائے نام بھی مذہبی نہیں۔ حد یہ ہے کہ اہلِ مغرب نے خدا سے وابستگی کے تصور کو جُنون اور جہالت قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ گویا خدا کے وجود سے خدا واسطے کا بَیر ہے!

ہم نے دیکھا کہ مذہب سے یہ منافرت محض دھوکا ہے، فریبِ نظر ہے۔ مسلم دنیا کے ہاتھوں مغربی طاقتوں کو جس ہزیمت کا سامنا رہا ہے، اُس کا پورا انتقام لینے سے اُس نے کبھی گریز نہیں کیا اور منتقم مزاجی بڑھتی ہی گئی ہے۔ اِس تضاد کو کیا کہیے کہ ایک طرف خدا کے وجود سے بیزاری ظاہر کی جاتی ہے اور دوسری طرف موقع ملتے ہی مسلمانوں کو گھیرنے سے گریز نہیں کیا جاتا اور اِسے صلیبی جنگوں کا انتقام قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ صلیبی جنگیں مغرب کی ذہنیت سے اب تک نہیں نکلیں۔

مغرب کا سنگھاسن ڈول رہا ہے؟

دنیا اُس موڑ پر کھڑی ہے جہاں مغرب کا سنگھاسن ڈول رہا ہے۔ یہ حقیقت اب اظہر من الشمس ہے کہ امریکا اور یورپ نے اپنا پرائم ٹائم بہت حد تک گزار لیا ہے۔ دونوں خطے تکنیکی برتری کے حامل تھے۔ اب یہ برتری زمیں بوس ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ ایک مرحلے پر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دونوں خطے مل کر کئی صدیوں تک دنیا پر راج کرتے رہیں گے اور اِن کی بالادستی کو چیلنج کرنے کا حوصلہ کسی کسی میں ہوگا اور وہ بھی بھرپور مزاحمت کے قابل نہ ہوگا۔ ابھی چار پانچ عشرے پہلے تک ایسا لگتا تھا کہ دنیا اب مغرب کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھل گئی ہے اور کوئی نیا سانچا صدیوں تک تیار نہ ہو پائے گا۔

مغرب کی حقیقی بالادستی

اس حقیقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ مغرب کی بالادستی واقعی حقیقی تھی اور رہی ہے۔ سوال صرف تکنیکی، معاشی اور عسکری قوت کا نہیں تھا۔ امریکا اور یورپ نے مل کر ایسا کلچر تخلیق کیا جس نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ جو کچھ اِن دونوں خطوں میں کھایا پیا گیا، پہنا گیا وہ اپنا لیا گیا۔ اِن دونوں خطوں کے لوگ جو طرزِ فکر رکھتے تھے، وہی باقی دنیا کے بیشتر حصے کی طرزِ فکر ٹھہری۔ امریکا اور یورپ نے مل کر باقی دنیا کے بیشتر حصے کے لیے رول ماڈل کی حیثیت اپنائی۔ یورپ میں نزاکت تھی، اس لیے بیشتر فیشن وہاں سے نکلے اور بے راہ رَوی کو بھی وہیں سے فروغ ملا۔ پیرس آج بھی فیشن کے نام پر بے ہودہ اور لایعنی رجحانات کا مرکز ہے۔ ہالینڈ کا دارالحکومت ایمسٹرڈیم مخربِ اخلاق فلموں کی تیاری کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یورپ کے بیشتر ممالک میں ناجائز اولاد اب کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ شادی کے بغیر ساتھ رہنے کو کسی بھی درجے میں قابلِ اعتراض یا بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ غیر فطری جنسی تعلق کو پہلے تو محض ایک رجحان سمجھا جاتا تھا، اب یہ فیشن کے درجے میں ہے اور اِس پر فخر بھی کیا جاتا ہے۔

مغرب کی بالادستی ہر شعبے میں رہی ہے۔ ایک طرف تو اُس نے جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے اپنے ہاں پروڈکشن کا عمل تیز اور بہتر کیا جس کے نتیجے میں برآمدات بڑھیں اور اشیا کے ساتھ ساتھ خدمات کی فروخت میں بھی اضافہ ہوا۔ معاشی اور مالیاتی حیثیت انتہائی مستحکم ہونے کی صورت میں عسکری قوت کا بڑھنا فطری امر تھا۔ مغرب نے یہ تصور بھی پروان چڑھایا کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے اور اب اُس پر حملہ کرنے اور اُسے مسخر کرنے کے بارے میں سوچنا بھی کم و بیش ناممکن ہے۔ دوسری طرف مغرب نے ثقافتی محاذ پر بھی اپنا غلبہ یقینی بنایا۔ ہالی ووڈ کی فلموں نے ایسا ماحول پیدا کیا جس میں یہ تصور پروان چڑھا کہ صرف گوری نسلیں ہی دنیا پر حکومت کرنے کی اہل ہیں، ساری عقل اُنہی میں پائی جاتی ہے، وہی تحقیق کا حق ادا کرسکتی ہیں، لڑنا بھی وہی جانتی ہیں اور باقی دنیا کو مطیع و فرماں بردار بنانے اور بنائے رکھنے کی استعداد اگر ہے تو صرف اُنہی میں ہے۔ مغرب ہی نے دیگر نسلوں کو ''کلرڈ'' کہنا شروع کیا۔ افریقا کے اصلی سیاہ فام باشندوں کے ساتھ مغربی طاقتوں نے چار صدیوں کے دوران جو کچھ کیا ہے، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ افریقا سے لوگوں کو پکڑ کر امریکا پہنچایا گیا اور پھر منڈیاں لگا کر اُنہیں فروخت کرنے کا چلن بھی متعارف کرایا گیا۔ غلامی کے دور میں افریقی نسل کے لوگوں پر جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے، وہ آج بھی اُن کی نسل کی سائیکی میں پیوست ہیں۔ جب مغرب کے لوگوں نے صلیبی جنگوں کو نہیں بھلایا تو پھر افریقا کے سیاہ فام باشندے صدیوں تک ڈھائے جانے والے مظالم کو بھلا کیونکر بھول سکتے ہیں؟

جادو بے اثر ہوتا جارہا ہے؟

چار صدیوں سے بھی زائد مدت تک برقرار رہنے والا جادو اب بے اثر ہونے لگا ہے۔ امریکا اور یورپ کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اب دنیا کو مٹھی میں رکھنا اُن کے لیے بہت مشکل ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ ایڈجسٹمنٹ کی جائے، افہام و تفہیم سے کام لیا جائے مگر ہم بھولتے ہیں کہ ہر دور میں سب سے بالادست سمجھے جانے والے معاشروں اور ریاستوں نے سمجھوتے سے گریز کیا ہے، کسی کے سمجھانے سے کچھ سمجھنے کو اپنی توہین سمجھا ہے۔ امریکا اور یورپ بھی ہٹ دھرمی کی راہ پر گامزن رہے ہیں اور اب تک ہیں۔ امریکا نے من مانی کی انتہا کردی۔ چوبیس سال قبل نائن الیون کے نام پر ایک جنگ افغانستان پر تھوپی گئی اور پھر اُس جنگ کو پھیلاتے پھیلاتے

مسلم دنیا کو تباہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ عراق، لیبیا، شام اور یمن کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ عراق پر وسیع تباہی کے ہتھیار تیار کرنے کا الزام تھا جو سراسر بے بنیاد ثابت ہوا۔ اِس پر بھی کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی گئی۔ امریکا نے مسلم دنیا کے قدرتی وسائل پر قبضے کی خاطر دہشت گردی کا راگ الاپا اور مسلمانوں کو پوری دنیا میں دہشت گرد کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی ایک ایسی شناخت بنادی گئی ہے جس سے دیگر مذاہب کے لوگ خوفزدہ رہتے ہیں۔ دو عشروں سے بھی زائد مدت کے دوران مسلم ریاستوں کو تاراج کرنے کا عمل جاری رکھا گیا ہے اور جب مزاحمت کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ مسلمان تو ہوتے ہی دہشت گرد ہیں۔

ایک زمانے سے جس لمحے کا انتظار کیا جارہا تھا وہ آگیا ہے۔ امریکا اور یورپ کی بالادستی کو بھرپور انداز سے چیلنج کرنے والا لمحہ ہمارے سامنے ہے۔ چین پوری قوت کے ساتھ میدان میں ہے۔ ہائی ٹیک کے شعبے میں چین کی غیر معمولی مہارت کی رونمائی پاکستان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ امریکا اور یورپ کی قیادتیں واضح طور پر پریشان ہیں۔ اُنہیں اپنے راستے بدلنے ہیں، پالیسیوں کو متوازن بنانا ہے۔ یورپ سبق سیکھ چکا ہے مگر امریکا اب بھی بدلی ہوئی زمینی حقیقتوں کو قبول اور تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ محض ہٹ دھرمی کی راہ پر گامزن ہے اور اپنی بالادستی برقرار رکھنے کے لیے بدحواسی کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی وائٹ ہاؤس میں دوبارہ آمد نے رہی سہی کسر پوری کردی ہے۔ امریکا عالمی سیاسی و معاشی نظام میں اب بھی مضبوط ہے اور اِسی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ طاقت گھٹ جانے پر بھی اُس کی طاقت گھٹی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی۔ یورپ کے مجموعی مزاج کو دیکھیے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اب لڑنے اور اپنے آپ کو طاقت کی کشمکش میں منوانے کے لیے تیار نہیں۔ امریکا کے برعکس یورپی قائدین مفاہمت چاہتے ہیں تاکہ جنگ و جدل کی راہ مسدود ہو اور تجارت و سرمایہ کاری کا دائرہ وسعت اختیار کرے۔ یورپ علم و فن کا مرکز ہے۔ وہ اِس کیفیت کا فائدہ بھی اٹھانا چاہتا ہے۔

چین اور اُس کے ہم خیال ممالک کے واضح طور پر سامنے آنے سے اِتنا ہوا ہے کہ اب دنیا امریکا اور یورپ سے ہٹ کر اور اُس سے آگے کا بھی سوچنے لگی ہے۔ کل تک یہ تصور بھی محال تھا کہ امریکا اور یورپ کے شکنجے سے نکل کر جیا جاسکتا ہے۔ اب ایک دنیا کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے کہ امریکا اور یورپ حتمی مقدر نہیں اور وہ مزید ڈھائی تین صدیوں تک راج کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں۔ دونوں کی طاقت میں تیزی سے رونما ہونے والی کمی نے معاملات کو کچھ کا کچھ کردیا ہے۔ امریکا اب تک اقتصادی پابندیوں کا ہتھیار استعمال کرکے متعدد ممالک کو دبوچتا آیا ہے۔ وہ دن ہَوا ہوئے۔ آج کی دنیا میں اقتصادی پابندیاں ایک خاص حد تک ہی اثر انداز ہوسکتی ہیں۔

مسلم دنیا کے لیے یہ سنہرا موقع ہے۔ اُسے طے کرنا ہے کہ کس طرف جانا ہے۔ ایک دنیا یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے کہ مسلم دنیا یہاں سے کس سمت روانہ ہوتی ہے۔ چین اور اُس کے ہم خیال ممالک کی صورت میں بازار میں ایک اور شاپنگ مال کھلا ہے۔ امریکا اور یورپ نے اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور اب بھی اُسے برقرار رکھنے پر بضد ہیں۔ کم از کم امریکا کا معاملہ تو ایسا ہے۔ مسلم دنیا اور دنیا بھر کی دوسری بہت سی ریاستوں کے پاس اب چوائس موجود ہے۔ وہ امریکا اور یورپ سے ہٹ کر بھی دیکھ سکتے ہیں، اپنے لیے اسٹریٹجک گہرائی پیدا کرسکتے ہیں۔ مسلم دنیا کو نئے شاپنگ مال کی طرف دیکھنا چاہیے۔ امریکا اور یورپ نے اُسے ہر اعتبار سے دھوکا دیا ہے۔ مسلم دنیا کی خوش بختی ہے کہ چین کے لیے ہراول دستے کا کردار پاکستان نے ادا کیا ہے۔ ساتھ ہی ترکیہ اور ایران بھی ہیں۔ افغانستان کے حکمرانوں کو بھی چینی حکومت نے آن بورڈ لے کر خطے میں حقیقی امن کی بحالی کا ڈول ڈالا ہے۔ یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ مسلم دنیا کو اِس موافق صورتحال کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

مسلم دنیا خاصی طویل مدت سے امریکا اور یورپ، دونوں ہی کو جھیل رہی ہے۔ امریکا نے بیسویں صدی کے دوران مسلم ریاستوں کو دبوچا جبکہ یورپی نوآبادیاتی طاقتیں اِس سے پہلے ڈھائی تین صدیوں تک مسلم دنیا کو خصوصی طور پر نشانہ بناتی رہیں۔ جب یورپی قوتوں نے نشاۃِ ثانیہ اور صنعتی انقلاب کے بعد غیر معمولی مادّی ترقی کے ذریعے طاقت میں اضافہ کرکے متعدد خطوں کو زیرِ نگیں کرنا شروع کیا تب جنوبی امریکا اور افریقا کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا پر بھی مشکل وقت آیا۔ فطری اور عصری علوم و فنون میں پیچھے رہ جانے کے باعث مسلم دنیا بھی عالمی سطح پر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔ امریکا اور یورپ بہت منظّم تھے۔ یورپ نے جو کچھ پایا، اُس سے دنیا کو بھی فیضیاب کیا۔ امریکا نے ایسا کوئی اہتمام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ اُس کی طاقت ہمیشہ برقرار رہے گی، وہ جسے بھی چاہے گا دبوچتا رہے گا اور کہیں سے کوئی بھی شدید ردِعمل سامنے نہیں آئے گا اور اُس سے باضابطہ طور پر، میدانِ جنگ میں ٹکرانے کے بارے میں تو کوئی سوچے گا بھی نہیں۔

اب معاملات بہت حد تک الٹ، پلٹ چکے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکا اور یورپ کے ہاتھ سے سب کچھ جاتا رہا ہے مگر خیر، یہ عمل شروع تو ہو چکا ہے۔ مسلم دنیا ایک طویل مدت سے انحطاط کا شکار ہے۔ جدید ترین یا عصری علوم و فنون کے شعبے میں اُس کی کارکردگی بہت خراب رہی ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوالے سے مسلم دنیا ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی جس کی بنیاد پر وہ کسی کے لیے رول ماڈل بن سکے۔ امریکا اور یورپ نے مل کر مشرقِ وسطیٰ کو ایک زمانے سے شدید اکھاڑ پچھاڑ اور افتراق و انتشار کا مرکز بنا رکھا ہے۔ عالمی معیشت کو زلزلے جیسی کیفیت سے دوچار کرنے کے لیے بھی مشرقِ وسطیٰ کو بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر مغربی طاقتوں نے اسرائیل کے قیام کی صورت میں مسلم دنیا کے قلب میں خنجر اُتار دیا۔ امریکا اور یورپ نے جس انداز سے اسرائیل کی سرپرستی کی ہے، اُسے پروان چڑھا کر مسلمانوں کے لیے اذیت کا سامان کیا ہے، وہ تاریخ کا انتہائی تاریک باب ہے۔ مسلم دنیا اسرائیل کی اندھی سرپرستی اور اُس کے ذریعے مسلمانوں کی دل آزاری کے اہتمام کے باعث امریکا اور یورپ دونوں ہی سے نالاں ہے اور موقع ملتے ہی اُن سے دور ہو جانے کو ترجیح دے گی۔ جس طور بنگلا دیش نے اب بھارت کے بغل بچے کی حیثیت ترک کرکے چین سے ہاتھ ملایا ہے اور مودی سرکار کے لیے انتہائی پریشانی کا سامان کیا ہے، بالکل اُسی طور مسلم دنیا کو اب چین اور روس کی طرف جھک کر امریکا اور یورپ دونوں ہی کو انتہائی سخت پیغام دینا چاہیے۔ ایک دنیا ہے کہ مسلم ممالک کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سیاسی اور اسٹریٹجک امور کے ماہرین یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں کہ اِس نازک موڑ پر مسلم دنیا کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا وہ چین کی طرف جھک کر امریکا اور یورپ کے لیے بقا کا سوال کھڑا کردے گی یا پھر امریکا کے دامن سے لپٹی رہ کر ایک عظیم لمحے اور سنہرے موقع کو ضائع کرے گی۔

اِس وقت تبدیلی کی سب سے زیادہ ضرورت جنوبی امریکا اور افریقا کے علاوہ مسلم دنیا کو ہے۔ مسلم ممالک شدید پسماندگی کا شکار ہیں۔ اُنہیں صدیوں کچل کر رکھا گیا ہے اور ایک صدی کے دوران امریکا نے بھی رہی سہی کسر پوری

کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ جب خالص مادّہ پرستی اور دہریت زدہ سوچ پروان چڑھانے کے باوجود مغرب نے اب تک صلیبی جنگوں کو بھلایا نہیں تو مسلم دنیا سے کیوں یہ توقع رکھی جائے کہ وہ صدیوں ڈھائے جانے والے مظالم بھول کر مغرب کو اپنا دوست سمجھ لیں گے۔ مسلم ممالک کو مغرب کی ذہنی اور معاشی غلامی سے نکلنے کے لیے قدرت کی طرف سے عطا کیے جانے والے اِس بھرپور موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حال ہی میں پاکستان نے جس طور صرف چند گھنٹوں کی فضائیہ معرکہ آرائی میں بھارتی فضائیہ اور مودی سرکار کو دُھول چٹائی ہے، اُس سے یہ حقیقت تو کھل کر سامنے آگئی کہ بھارت کے تِلوں میں تیل نہیں۔ چین عملی سطح پر مسلم ریاستوں سے گِھرا ہوا ہے۔ اِدھر پاکستان، اُدھر بنگلا دیش، تیسری سمت افغانستان اور سَر سے اُوپر دیکھیے تو وسطِ ایشیا اور بحرِ ہند کی طرف دیکھنے پر مالدیپ ہے۔ سری لنکا اور نیپال بھی بھارت سے دبنے کے لیے اب تیار نہیں۔ وہ جان گئے ہیں کہ بھارتی قیادت صرف گیدڑ بھبکیاں دے سکتی ہے۔ ایسے میں مسلم دنیا کو چین اور روس کی طرف واضح طور پر جھک کر بھارت کو بھی پیغام دینا چاہیے کہ اب وہ من مانی نہیں کرسکتا اور اگر اُسے اپنی معاشی قوت برقرار رکھنی ہے تو لڑنے بھڑنے کا خیال ذہن سے جھٹک کر پھینک دے اور ایسے اقدامات کرے جن سے مسلم دنیا اُس سے راضی رہے۔ ترکیہ ایک مضبوط اور قائدانہ بصیرت کا حامل ملک ہے۔ بھارت نے اُسے بھی ناراض کردیا ہے۔ خلیج کی متمول ریاستیں اگر امریکا سے مرعوب ہونا بہت حد تک ترک کریں اور سرمایہ کاری کے حوالے سے ترجیحات تبدیل کریں تو بہت کچھ یوں بدلے گا کہ دیکھنے والوں کو یقین بھی نہیں آئے گا۔

مسلم دنیا کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی مدد سے دنیا میں بہت بڑی تبدیلی لائی جاسکتی ہے، طاقت کا توازن بدلا جاسکتا ہے۔ قدرتی وسائل سے مسلم دنیا مالا مال ہے۔ یہ قدرتی وسائل ہی تو ہیں جو ایک مدت سے سعودی عرب، قطر، کویت، متحدہ عرب امارات اور چند دوسرے متمول مسلم ممالک کو اہم مقام دیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف پسماندہ مسلم ممالک میں بھی باصلاحیت لوگوں کی کمی نہیں۔ تعلیم و تربیت اور تحقیق کا معیار بلند کرکے اِن ملکوں کے کروڑوں نوجوانوں کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی دنیا کے لیے تیار کیا

////// باقی صفحہ نمبر ۶ \\\\\\

ٹرمپ اسرائیلی جارحیت روکنے میں ناکام؟

ملیحہ لودھی

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے مشرق وسطیٰ کے حالیہ سہ ملکی دورے کے دوران بین الاقوامی میڈیا کی رپورٹس میں بتایا گیا کہ انہوں نے اسرائیل کو دورے سے قبل یا مشرقِ وسطیٰ میں کیے گئے اپنے فیصلوں میں دیوار سے لگایا اور ایسا کرنے کی ان کے پاس معقول وجہ تھی۔

ٹرمپ نے جو اقدامات کیے، انہوں نے یقینی طور پر اسرائیلی وزیراعظم بنیامن نیتن یاہو کو پریشان کیا۔ واشنگٹن نے شام پر سے پابندیاں اٹھالیں اور ٹرمپ نے ریاض میں شامی صدر احمد الشراع سے ملاقات بھی کی جس موقع پر انہوں نے ایک ایسے شخص کی تعریف کی جس کے سر پر امریکا نے انعام رکھا تھا۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے ترکیہ کے صدر رجب طیب ایردوان کی بھی تعریف کی جو کہ اسرائیل کے ایک اور مخالف ہیں۔ انہی کے مشورے پر امریکی صدر نے شام پر سے پابندی اٹھائیں۔ دوسری جانب نیتن یاہو نے ٹرمپ پر زور دیا تھا کہ وہ پابندیاں ختم نہ کریں۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے یمن میں حوثیوں کے ساتھ جنگ بندی بھی کی جس کے ساتھ ہی دونوں فریقین نے ایک دوسرے کے خلاف فوجی حملے روکنے پر اتفاق کیا۔ اس معاملے میں بھی اسرائیل کو نظرانداز کیا گیا۔ ٹرمپ نے امریکا اور حماس کے درمیان براہ راست مذاکرات کے نتیجے میں غزہ میں آخری امریکی یرغمالی کی رہائی کو بھی یقینی بنایا۔ لیکن تل ابیب کو سب سے زیادہ جس امر نے پریشان کیا، وہ ڈونلڈ ٹرمپ کا ایران سے براہ راست جوہری مذاکرات کرنا ہے جس کی اسرائیل سختی سے مخالفت کرتا رہا ہے۔

یہ رپورٹس سامنے آرہی ہیں کہ امریکا کو 'نئی' انٹیلی جنس اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ اسرائیل ایران کی جوہری تنصیبات کو نشانہ بنانے کے لیے فوجی کارروائی کی تیاری کررہا ہے۔ اگر اسرائیل نتائج کی پروا کیے بغیر ایسا کرتا ہے تو ڈونلڈ ٹرمپ کی سفارتی کوششوں اور نیتن یاہو کے واشنگٹن کے ساتھ تعلقات کو نقصان پہنچے گا، بالخصوص اب کہ جب حال ہی میں ٹرمپ نے ٹیلی فونک گفتگو میں نیتن یاہو سے کہا ہے کہ امریکا اور ایران کے درمیان مذاکرات درست سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

''فنانشل ٹائمز'' کے لیے لکھتے ہوئے کم گٹاس کہتی ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں ڈونلڈ ٹرمپ کے اقدامات 'اسرائیل کو حیرت میں مبتلا کررہے ہیں کہ وہ اسے معاہدوں سے الگ کررہے ہیں'۔ انہوں نے نوٹ کیا کہ نیتن یاہو کے ساتھ ٹرمپ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہورہا ہے لیکن 'اسرائیل اور امریکا کے درمیان دہائیوں پرانا اتحاد قائم رہے گا'۔ دیگر مبصرین نے اسرائیلی وزیراعظم کو ٹرمپ کے دورے کے دوران محض ایک 'تماشائی' کے طور پر دیکھا کیونکہ امریکی صدر اسرائیل کے دشمنوں کے قریب ہوگئے ہیں۔

اس سب کے باوجود ڈونلڈ ٹرمپ اسرائیل کو غزہ میں نسل کشی سے روکنے میں ناکام ہیں یا وہ اسے روکنے کے لیے تیار نہیں ہیں حالانکہ وہ طویل عرصے سے تنازع کے خاتمے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اگرچہ وائٹ ہاؤس نے خبردار کیا تھا کہ بنیامن نیتن یاہو اگر جنگ جاری رکھتے ہیں تو اس میں تنہا ہوں گے۔ اسرائیل نے غزہ میں اپنی وحشیانہ کارروائیوں کو وسعت دی ہے اور انسانی امداد کی بندش کو جاری رکھا ہے۔

روزانہ فضائی حملوں میں فلسطینیوں کو شہید کیا جارہا ہے جبکہ نیتن یاہو نے 'حماس کو ہمیشہ کے لیے تباہ' کرنے کے لیے پورے غزہ پر کنٹرول حاصل کرنے کی دھمکی دی ہے۔ اسرائیل کے آپریشن 'گیدیئن چیریٹس' (Gideon's Chariots) کو انجام دینے کے لیے جنوبی اور شمالی غزہ میں اضافی فوجی دستے تعینات کیے گئے ہیں جن کا مقصد فلسطینیوں کو غزہ سے بے دخل کرنا ہے۔ لاکھوں فلسطینیوں کو ایک بار پھر ان کی چھتوں سے جبراً محروم کیا جارہا ہے۔ فلسطینیوں کی بے دخلی ہمیشہ سے بنیامن نیتن یاہو کا مقصد رہا ہے۔

اس سب نے تباہ کُن صورتحال کو جنم دیا ہے جبکہ انسانی بحران کو سنگین تر بنادیا ہے جس کی وجہ سے لاکھوں فلسطینی فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ اسرائیلی جارحیت اور انسانی امداد کی ناکہ بندی نے بین الاقوامی سطح پر اضطراب پیدا کیا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتریس نے اس سنگین صورتحال کو 'ناقابلِ بیان، ظالمانہ اور غیرانسانی' قرار دیا ہے۔ امداد کی بندش ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا، غزہ کی 'پوری آبادی کو قحط کے خطرے کا سامنا ہے'۔

حتیٰ کہ اسرائیل کے قریبی مغربی اتحادیوں نے بھی تل

ادیب کے خلاف آواز اٹھائی ہیں۔ مشترکہ بیان میں فرانس، برطانیہ اور کینیڈا نے غزہ اور مغربی کنارے میں اسرائیل کی عسکری جارحیت کی مذمت کی اور دھمکی دی کہ اگر اسرائیل نے کارروائیاں اور امداد کی پابندیاں ختم نہیں کیں تو اس کے خلاف 'ٹھوس اقدامات' کیے جائیں گے جن میں پابندیاں لگائے جانے کا امکان بھی شامل ہے۔ یورپی یونین نے اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات پر نظرثانی کرے گا جبکہ اسپین جیسے ممالک نے عالمی برادری سے پابندیوں سمیت سخت اقدامات کا مطالبہ کیا ہے۔

۲۳ ممالک نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں اسرائیل سے غزہ میں امدادی سامان کے داخلے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا گیا اور متنبہ کیا گیا کہ لوگوں کو 'فاقہ کشی' کا سامنا ہے۔ بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے اسرائیل نے غزہ میں کچھ امداد سامان کی ترسیل کی اجازت دی لیکن عالمی برادری نے اس اقدام کو ناکافی قرار دیا۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ردعمل میں کہا، 'یہ اشتعال انگیز اور اخلاقی طور پر قابلِ مذمت ہے کہ نسل کشی کے دوران، بھوک اور ظلم کے تقریباً ۸۰ دنوں کے بعد دنیا نے مکمل محاصرے کو تھوڑا سا کم کرنے کے لیے اسرائیل پر دباؤ ڈالا جس نے خوراک، ادویات، ایندھن اور دیگر تمام اشیا کے داخلے کو مکمل بند کیا ہوا ہے'۔

دوسری جانب دوحہ میں حماس اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی معاہدے کی تجدید کی کوششیں کسی نتیجہ کی جانب جاتی نظر نہیں آ رہیں۔ حالانکہ ٹرمپ انتظامیہ پیشرفت نہ ہونے پر اضطراب کا شکار ہے لیکن پھر بھی وہ اسرائیل کو امن پر آمادہ کرنے میں ناکام ہے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ امریکی نائب صدر جے ڈی وینس نے رواں ماہ اسرائیل کا دورہ نہ کرنے کا فیصلہ لیا۔ اگرچہ اسرائیلی جارحیت کے باوجود بھی بات چیت جاری رہی لیکن نیتن یاہو نے معاہدے میں بہت کم دلچسپی دکھائی۔ انہوں نے مارچ میں یک طرفہ طور پر جنگ بندی معاہدے کو توڑا اور بار بار اعلان کیا کہ وہ تب تک جنگ ختم نہیں کریں گے کہ جب تک انہیں حماس کے خلاف 'مکمل فتح' حاصل نہیں ہو جاتی۔

ان حملوں میں غزہ نے زیادہ خونریزی، نقل مکانی اور تباہی کا سامنا کیا۔ غزہ تک امداد پہنچانے کا امریکی حمایت یافتہ اسرائیلی منصوبہ بہت متنازع ہے۔ اس میں چند اہم امدادی مراکز کا قیام شامل ہے جہاں لوگوں کو مدد حاصل کرنے کے لیے طویل فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ ان مراکز کی حفاظت فوجی اور نجی مسلح سیکورٹی فورسز کریں گی۔

سوئٹزرلینڈ کی ایک کمپنی غزہ ہیومینیٹیرین فاؤنڈیشن، ان مراکز کا انتظام سنبھالے گی۔ اقوام متحدہ نے اس منصوبے کو مزید نقل مکانی کی ایک حکمت عملی قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی ہے کیونکہ یہ ایک جنگی جرم ہے۔ اقوام متحدہ کے اعلیٰ امدادی اہلکار نے یہ بھی کہا کہ اس منصوبے میں لوگوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے فاقہ کشی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں نے اس منصوبے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے امداد کی بندش کو عسکریت پسندی قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔

اسرائیل کی جانب سے پورے غزہ پر مستقل طور پر قبضہ کرنے کے لیے فوجی مہم شروع کرنے کے بعد، انتہائی دائیں بازو کے اسرائیلی وزیر خزانہ بیزالیل اسموترخ نے ایک نیوز کانفرنس میں بتایا کہ ان کا مقصد 'غزہ کی پٹی میں موجود ہر چیز کو تباہ کرنا ہے' اور آبادی کو 'جنگی علاقوں' سے باہر دھکیلنا ہے۔ انہوں نے مزید کہا، 'آبادی پٹی کے جنوب میں پہنچ جائے گی، اور (پھر) صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے منصوبے کے تحت کسی تیسرے ممالک میں چلے جائیں گے'۔

نیتن یاہو نے کہا ہے کہ جب حماس تمام یرغمالیوں کو رہا کرے گا اور ٹرمپ کے غزہ سے باہر آبادی کو منتقل کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد ہو جائے گا تو وہ جنگ ختم کر دیں گے۔

اب یہ واشنگٹن کی ذمہ داری ہے کہ وہ واضح کرے کہ آیا اسرائیل واقعی ٹرمپ کے منصوبے پر عمل پیرا ہے یا نہیں۔ یہ وضاحت ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو اس سے اسرائیل پر جارحیت روکنے کے لیے دباؤ پڑے گا۔ لیکن اگر یہ سچ ہے تو اس سے امریکی صدر کے امن پسند تشخص کو نقصان پہنچے گا جس کے فروغ کی وہ بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔

"The forever war".

(Daily "Dawn" Karachi. May 26,2025)

○○○

بقیہ: ایک افریقی سیاسی راک اسٹار کی تقریر

ہم بھول گئے کہ آئی ایم ایف سے بہت پہلے ٹمبکٹو کا تہذیبی مرکز بھی تھا۔ نوآبادیاتی دور سے پہلے یہاں شاندار سلطنتیں تھیں جن کے پاس باقاعدہ افواج بھی تھیں مگر یونیورسٹیاں بھی تھیں۔ تجارتی راستے بھی آباد تھے۔ قانون سازی بھی ہوتی تھی۔ ہم غریب نہیں تھے۔ ہمیں غریب بنایا گیا۔

لہٰذا جب آپ تعلیم حاصل کر کے کچھ بڑا سوچنا یا کرنا چاہتے ہو تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ جب آپ منظّم ہونے کی کوشش کرتے ہو تو وہ کانپنے لگتے ہیں۔ جب آپ متحد ہونے کا سوچتے ہو تو وہ سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں آپ کے غصے سے نہیں بلکہ باشعور ہونے کے خدشے سے بے چینی ہے۔ وہ آپ کے احتجاج سے نہیں بلکہ زندگی کی مقصدیت کی تلاش سے پریشان ہیں۔ جب لوگ خودشناس ہو جاتے ہیں تو ان پر کسی جھوٹ کا جادو نہیں چل سکتا۔ مگر آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تسلط کمزور ہونے لگتا ہے تو مسلط طاقت پوری قوت سے آخری وار ضرور کرتی ہے۔ آنکھیں اور دماغ مستعد ہوں تب ہی اس آخری حملے کو پسپا کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ آپ سے پریشان ہیں کہ آپ ان کی اجازت کے بغیر کیوں اٹھنے کی ہمت کر رہے ہیں تو ان کی پریشانی بجا ہے۔ غاصب زنجیریں ٹوٹنے کی آواز آخر کیوں پسند کرے۔

ہاں ہمارا صدیوں استحصال ہوا، ہمارے مصائب سے تجوریاں بھری گئیں، ہماری خاموشی کو صبر کے بجائے کمزوری سمجھا گیا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے زخم دکھا کر ہمدردیاں بٹورنے میں ہی لگے رہیں۔ ہمیں تشدد، انتقام اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے جال میں نہیں پھنسنا۔ ورنہ جتنا سفر درپیش ہے، اُس سے دوگنا کرنا پڑے گا۔ خدا ہمارا مددگار رہو۔

(بحوالہ: روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی۔ ۳ جون ۲۰۲۵ء)

○○○

بقیہ: فیصلہ کُن قدم مسلم دنیا ہی کو اُٹھانا ہے!

جا سکتا ہے۔ اگر مغرب کے ہاتھوں ذہنی مغلوبیت کے دام سے یہ لوگ نکلیں گے تو کچھ کر پائیں گے۔ مغرب نے مسلم دنیا کو کم و بیش پانچ صدیوں کے دوران انتہائی نوعیت کی خرابیوں سے دوچار کیا ہے۔ اب حالات بدلے ہیں، مارکیٹ میں نئی سپر پاور آئی ہے تو لازم ہے کہ موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حقیقی تبدیلیوں کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ اس معاملے میں تاخیر کی گنجائش ہے نہ غلطی کی۔

ایسا نہیں ہے کہ راتوں رات بہت کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلم دنیا کو بہت تیزی سے بہت کچھ مل جائے گا۔ کسی بھی معاملے میں حقیقی پیشرفت مرحلہ وار ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا طریق ہے۔ کائنات کا نظام اِسی طور چل رہا ہے۔ ہم نے یعنی مسلم دنیا نے جہاں صدیوں تک پریشانیاں جھیلی ہیں، وہیں اگر چند حقیقی تبدیلیوں کے لیے دو تین عشروں کا انتظار کر لیں تو ایسا کرنے میں کیا ہرج ہے؟ اگر بہت بڑے پیمانے پر یعنی عالمی سطح پر کوئی بہت بڑی تبدیلی لانی ہے اور اُس میں سے اپنے لیے چند فوائد کشید کرنے ہیں تو لازم ہے کہ انتظار کی زحمت بھی گوارا کی جائے۔

○○○

بھارت: ۴۷ کروڑ محنت کشوں کی داستانِ اَلم

Rejimon Kuttappan

بھارت ایک بڑی معاشی قوت ہے اور اب مزید بڑی معاشی قوت بننے کے خبط میں مبتلا ہے۔ بھارتی قیادت چاہتی ہے کہ بھارتی معیشت چند ہی برس میں پانچ ہزار ارب ڈالر کے ٹرن اوور کی حامل ہو جائے۔ دنیا کی تیسری بڑی معیشت بننے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے بھارتی قیادت اور معاشی ماہرین بہت کچھ کر رہے ہیں۔ اُن کی کوشش ہے کہ بھارت کا مینوفیکچرنگ سیکٹر اُتنا ہی مضبوط ہو جائے جتنا چین کا ہے یعنی بہت بڑے پیمانے پر مینوفیکچرنگ ہو، تاکہ برآمدات کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جاسکے۔

بھارت میں غیر منظّم شعبوں سے وابستہ محنت کشوں کی تعداد ۴۰ کروڑ سے زائد ہے۔ یہ محنت کش دن رات ایک کرتے ہیں مگر ڈھنگ سے جینے کے قابل نہیں ہو پاتے۔ اِنہیں اُجرت بہت کم ملتی ہے۔ سرکاری محکموں میں رجسٹریشن نہ ہونے کے باعث اِن سے کام لینے والوں کو قوانین کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اِن محنت کشوں کی شدید حق تلفی ہوتی ہے۔ اِن کی صحت اور سلامتی کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اِن کی اُجرتیں روک دی جاتی ہیں، بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق اِن ۴۰ کروڑ محنت کشوں کے حالات جبری مشقت سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

مشینری کے بے ہنگم اور متواتر شور کے دوران روی کمار گپتا اسٹیل کی بھٹی میں اسکریپ جھونکتا رہتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسٹیل کی پیداوار یقینی بنانے کے لیے متعلقہ کیمیکلز بھی ڈالتا ہے۔ اِس بھٹی میں پگھلا ہوا لوہا دہک رہا ہے اور روی کمار گپتا اِس کے بہت نزدیک ہے یعنی شدید گرمی جھیل رہا ہے۔ اسٹیل کی بھٹی کو چالو رکھنا روی کمار کا کام ہے جس کے لیے ایندھن کے ساتھ ساتھ ایئر فلو کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

روی کمار جس فیکٹری میں کام کرتا ہے، وہ بھارت کی مغربی ریاست مہاراشٹر کے تاراپور انڈسٹریل ایریا میں ہے۔ روی کمار کو کام کے لیے دیا جانے والا سامان دقیانوسی ہے۔ اُس کا ہیلمٹ ٹوٹا پھوٹا ہے۔ جوتوں کی جگہ وہ محض سلیپرز پہنے ہوئے ہے۔ انتہائی گرم ماحول میں سلیپرز پہن کر کام کرنا انتہائی خطرناک ہے مگر روی کمار مجبور ہے کہ کسی طور گھر کا چولہا بھی تو جلتا رکھنا ہے۔ اُس کی آنکھیں تھکن سے لال ہیں۔ اُس کی ٹی شرٹ بہت پُرانی ہے جس کا رنگ بھی اُڑا ہوا ہے۔ اُس نے جینز پہن رکھی ہے۔ وہ چائے پینے کے لیے باہر نکلا ہے اور پسینے میں شرابور ہے۔

روی کمار کا تعلق اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی سے ہے۔ روی کمار کو یہ انتہائی محنت طلب جاب کرنے کے صرف ۱۷۵ ڈالر ماہانہ ملتے ہیں۔ انڈین کرنسی میں یہ تنخواہ تقریباً ۱۵ ہزار روپے بنتی ہے۔ بھارت میں فی کس آمدنی ۲۰۰ ڈالر ہے یعنی روی کمار کو اِس اوسط سے بھی ۲۵ ڈالر کم مل رہے ہیں۔ تنخواہ اکثر دیر سے ملتی ہے۔ تنخواہ کا چیک مہینے کی ۱۰ تا ۱۲ تاریخ تک ملتا ہے۔

جو ''بچو لیے'' مہاراشٹر کی فیکٹریوں کو افرادی قوت فراہم کرتے ہیں، وہ اِس تنخواہ میں سے ہر ماہ ۱۱ تا ۱۷ ڈالر اپنے کمیشن کے طور پر کاٹ لیتے ہیں۔ کینٹین کی مد میں ہر ماہ ۷ ڈالر کاٹ لیے جاتے ہیں۔ روی کمار کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ بہت حد تک جبری مشقت جیسا ہے مگر سوال یہ ہے کہ ہم کریں تو کیا کریں۔ اگر یہ بھی نہ کریں تو گزارا کیسے ہو؟

جاب چھوڑنا کوئی آپشن نہیں۔ اُس کی دو بیٹیاں ہیں۔ ماں، بیوی اور دو بیٹیوں کو پالنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ اُس کے گھر والے گاؤں میں رہتے ہیں اور وہاں کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ والد بہت بوڑھے اور بیمار ہیں یعنی کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ پوری فیملی ہر ماہ روی کمار کی طرف سے بھیجے ہوئے ۱۰۰ ڈالر میں گزر بسر کرتی ہے۔

دیہی علاقوں میں ملازمت کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کھیتی باڑی کا معاملہ بہت بگڑا ہوا ہے۔ بارانی زمین ہے جسے بارش کا انتظار رہتا ہے۔ ایسے میں شہر جاکر گھٹیا نوکری کے سوا کوئی آپشن نہیں بچتا۔

روی کمار اُن کروڑوں مصائب زدہ بھارتیوں میں سے ہے جو بھارت کو پانچویں بڑی معیشت بنانے کے مودی سرکار کے خواب کی تعبیر کے لیے حالات کی چکی میں پیسے جا رہے ہیں۔ ۲۰۲۳ء میں بھارتی معیشت کا ٹرن اوور ساڑھے تین ہزار ارب ڈالر تھا۔ وزیراعظم نریندر مودی کا عزم ہے کہ دو تین سال کے اندر یہ ٹرن اوور پانچ ہزار ارب ڈالر ہو جائے۔ دنیا بھر کے سرمایہ کاروں کو بھارت میں سرمایہ کاری کے لیے سنہرے خواب دکھائے جاتے رہے ہیں۔ مودی سرکار کہتی ہے کہ بھارت سرمایہ کاری کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ بیرونی سرمایہ کاروں کو زیادہ منافع کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔ یہ یقین دہانی اِس بنیاد پر کرائی جاتی ہے کہ بھارت میں محنت کشوں کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں۔ اُنہیں معقول اجرت دی جاتی ہے نہ سہولتیں۔ اُن کی سلامتی اور صحت کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا۔ معمولی اجرتیں دینے کی صورت میں سرمایہ کاری پر زیادہ منافع دینا ممکن ہو جاتا ہے۔

غیر منظّم شعبوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے لیے دوسری بہت سی سہولتوں کی طرح سالانہ چھٹیوں کی بھی سہولت نہیں۔ وہ مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ صحت کا خیال بالکل نہیں رکھا جاتا۔ اسٹیل ملز میں کام کرنے والوں کو کھانے پینے کے لیے جو کچھ ملنا چاہیے، وہ نہیں ملتا۔

روی کمار کو ہفتے کے ساتوں دن کام کرنا پڑتا ہے حالانکہ ۱۸۹۰ء میں بھارت میں تمام ملازمین کے لیے ہفتے میں ایک چھٹی کا قانون منظور کرلیا گیا تھا۔ بھارت میں ہزاروں فیکٹریاں ایسی ہیں جن کے ملازمین کو پے سلپ بھی نہیں ملتی جس میں تنخواہ کی پوری تفصیل درج ہوتی ہے۔ شفافیت کا فقدان ہے۔ اُن کی اجرت سے جو رقم منہا کی جاتی ہے، اُس کے بارے میں بھی کچھ بتایا نہیں جاتا۔

اگر کوئی ملازم دو تین دن غیر حاضر رہے تو اُس کا حاضری کارڈ غیر مؤثر کردیا جاتا ہے۔ واپسی پر اُنہیں نئے ملازم کی حیثیت سے برتا جاتا ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ اور گریجویٹی کا تصور تک نہیں ہے۔

بھارت میں غیر منظّم شعبے کے ۳۰ کروڑ سے زائد محنت کشوں کی مجبوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ وہ آجروں کی شرائط کے تحت کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اُنہیں پوری اجرت ملتی ہے نہ کوئی سہولت۔ جو معمولی سا کھانا اور چائے فراہم کی جاتی ہے، اُس کے پیسے بھی کاٹ لیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اجرتیں روکی جاتی ہیں تاکہ کوئی کام چھوڑ کر نہ جائے۔ اگر کسی کی ڈیڑھ دو ماہ کی اجرت رکی ہوئی ہے اور وہ کام چھوڑ کر چلا جائے تو اجرت ہڑپ کرلی جاتی ہے۔

روی کمار نے بتایا کہ غیر منظّم شعبے کے ملازمین کو ملازمت کا کنٹریکٹ بھی نہیں دیا جاتا۔ انہیں یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ انہیں ملازمت کے دوران کون سی سہولتیں دی جائیں گی اور کون سی نہیں۔

انڈین جرنل آف لیگل ریویو میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق غیر منظّم شعبوں کے بیشتر محنت کشوں کو جاب ایگریمنٹ نہ ہونے کے باعث پوری اجرت نہیں ملتی۔ اجرت روک بھی لی جاتی ہے اور بعض معاملات میں جبری

مشقت بھی لی جاتی ہے یعنی اضافی کام کروا کے اُس کا معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ دوسری ریاستوں سے آ کر کام کرنے والوں کا استحصال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے گھروں سے بہت دور ہوتے ہیں، اِس لیے کسی بھی شرط کے تحت کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اِن کے آبائی علاقوں میں افلاس بہت زیادہ ہے، اس لیے یہ کوئی سی بھی جاب کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ غیر منظّم شعبے کی بہت سے فیکٹریوں میں محنت کشوں کو انتہائی نامساعد حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔ سلامتی اور صحت کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا۔ بہت سے محنت کش کام کی نوعیت کے باعث جلد بیمار پڑ جاتے ہیں اور اُن کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ سلامتی یقینی بنانے والی سہولتیں ناپید ہوتی ہیں۔ اگر کسی سے کہیے کہ خطرناک حالات میں کام کیوں کر رہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ افلاس اور بے روزگاری اِتنی زیادہ ہے کہ اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ ملازمت مل جائے یہی بڑی بات ہے۔ سہولتوں کی بات کون کرے؟ انسان جب افلاس کی چکی میں پس رہا ہو اور بے روزگاری سر پر منڈلا رہی ہو تو کوئی بھی کام کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔

بھارت کی مختلف ریاستوں میں غیر منظّم شعبے کے کروڑوں محنت کش مختلف فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ اِن میں مچھلیوں اور جھینگوں کی پروسیسنگ کے ادارے بھی شامل ہیں۔ یہ برآمدی شعبہ ہے۔ آجر تو بہت کماتے ہیں مگر ملازمین کو برائے نام اجرت دیتے ہیں۔ بیشتر فیکٹریوں میں کام کرنے کا انداز بیگار والا ہے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور افلاس کو دیکھتے ہوئے آجر پریشان حال لوگوں کی مجبوری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دیہی علاقوں کی لاکھوں خواتین جھینگے چھیلنے اور مچھلی کو صاف کر کے اُس کے ٹکڑے کرنے کا کام کرتی ہیں۔ دن بھر کی بدن توڑ مشقت کے بعد بھی اُنہیں معقول معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ انتہائی بدبودار ماحول میں کام کرنے سے اِن کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ صحت کا معیار بلند کرنے کا اہتمام بھی نہیں کیا جاتا۔ خلیجِ بنگال سے جڑی ہوئی بھارتی ریاستوں میں سی فوڈ کی فیکٹریاں بہت بڑے پیمانے پر ہیں۔ ان فیکٹریوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو بھی سخت نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سی فوڈ سیکٹر سے جڑے ہوئے محنت کشوں کو بھی ملازمت کا کنٹریکٹ ملتا ہے نہ سہولتیں۔ اِن کی اجرتیں بھی بہت معمولی ہوتی ہیں اور بالعموم یومیہ بنیاد پر اجرت دی جاتی ہے۔ بُرے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ محنت بھی اپنے حقوق سے دست بردار رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ بھارت ہر سال اربوں ڈالر کا سی فوڈ برآمد کرتا ہے۔ برآمدی تاجر خطیر منافع کماتے ہیں مگر اُن کے اجیر بہت بُرے حالات سے دوچار رہتے ہیں۔ سُمیتا بتاتی ہے کہ دن بھر کام کرنا پڑتا ہے۔ بہت مشکل سے صرف آدھے گھنٹے کے لیے کھانے کا وقفہ ملتا ہے۔ خواتین کو اپنی جسمانی پیچیدگیوں کے باوجود کام کرنا پڑتا ہے۔ اُنہیں کسی بھی حوالے سے ریلیف نہیں دیا جاتا۔ سُمیتا کو یومیہ ساڑھے چار ڈالر تک اجرت ملتی ہے مگر اِس میں سے اچھی خاصی رقم مختلف مدوں میں منہا کر لی جاتی ہے۔ اجرت نقدی کی صورت میں ملتی ہے اور کوئی پے سلپ وغیرہ نہیں ہوتی۔ وہ کہیں فریاد بھی نہیں کر سکتی۔

سُمیتا جیسی کروڑوں خواتین سخت نامساعد حالات میں کام کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ جن دیہی علاقوں سے وہ تعلق رکھتی ہیں، وہاں ملازمت کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں اور کھیتوں میں کام کرنے کا معاوضہ برائے نام ہے۔ چند ایک گھروں میں گائیں اور بھینسیں ہوتی ہیں جن کا دودھ بیچ کر گزارا ہوتا ہے مگر گائے یا بھینس خریدنا بھی تو ایک دردِ سر ہے۔ مینو کی بھی یہی کہانی ہے۔ اُس کا تعلق مشرقی بھارت کی ریاست اوڈیشا (اُڑیسہ) سے ہے۔ وہ بھی کم پیسوں میں کام کرنے پر مجبور ہے۔ اور اُسے بھی کوئی بنیادی سہولت میسر نہیں۔

سی فوڈ کی بیشتر کمپنیوں میں کام کرنے والوں کو وہیں رہنا پڑتا ہے۔ اُنہیں ہفتے میں صرف ایک بار محض تین گھنٹے کے لیے گھر جانے کی اجازت ملتی ہے تاکہ وہ ہفتے بھر کے لیے ضروری چیزیں لا سکیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کروڑوں بھارتیوں کی حق تلفی کس طور کی جا رہی ہے۔ مینو بتاتی ہے کہ اُس نے غربت کے باعث صرف انیس سال کی عمر میں گھر چھوڑا تاکہ والدین اور بھائی بہنوں کے لیے کچھ کر سکے۔ ایسا کیے بغیر بقا کا سوال ہی نہیں تھا۔ مینو کو ماہانہ صرف ۱۱۰ ڈالر ملتے ہیں۔ اِتنی معمولی سی رقم میں وہ اپنے اہلِ خانہ کو پالتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ ہمارا استحصال کیا جا رہا ہے مگر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں فیکٹری کی حدود میں رکھا جاتا ہے۔ ہم کسی سے کوئی فریاد بھی نہیں کر سکتے۔ کوئی بنیادی سہولت آسانی سے میسر نہیں۔ صحت کا خیال رکھا جاتا ہے نہ ہی انشورنس کرایا جاتا ہے۔ ہم پر مسلسل نظر رکھی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اور اُس کی مناسبت سے معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ کیمروں کے ذریعے نگرانی اِتنی زیادہ کی جاتی ہے کہ ہمیں لگتا ہے ہم کسی بہت بڑی جیل میں ہیں۔ متعلقہ محکموں سے جب اِس سلسلے میں جواب طلب کیا گیا تو اُنہوں نے وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

محنت کشوں کے قوانین سے متعلق امور کے ماہرین کہتے ہیں کہ کروڑوں افراد سے ہونے والی شدید ناانصافی کے خاتمے کے لیے جدوجہد لازم ہے۔ آجروں کو اس بات کا پابند کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ محنت کشوں کو اُن کے حقوق دیں۔ اجرتیں بھی پوری ملنی چاہئیں اور متعلقہ سہولتیں بھی۔ جن شعبوں میں صحت کو زیادہ خطرات لاحق ہوتے ہیں، اُن سے وابستہ محنت کشوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جانی چاہئیں تاکہ اُن کی صحت کا گراف نہ گرے۔ غیر منظّم اور نیم منظّم شعبوں میں حق تلفی روکنے کے لیے حکومت کو بھی اُس کا کردار ادا کرنے کی تحریک دینے کی ضرورت ہے۔

بھارت کی مرکزی حکومت نے اب تک ان کروڑوں محنت کشوں کو اُن کے حقوق دلوانے کے حوالے سے کچھ خاص نہیں کیا ہے۔ مرکزی وزیر محنت شوبھا کرنڈلاجے نے پارلیمنٹ کو بتایا ہے کہ اِن محنت کشوں کو ایک سرکاری اسکیم کے تحت رجسٹر کیا گیا ہے مگر خیر اب تک اس حوالے سے کچھ ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ محققین کا کہنا ہے کہ بھارت میں غیر منظّم شعبے سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کی تعداد ۳۰ کروڑ سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ لوگ چونکہ حالات سے مجبور ہیں، اِس لیے شکایت نہیں کر سکتے، احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اِن کے لیے آواز اٹھانا بھی بہت مشکل ہے کیونکہ دستاویزات ناپید ہیں۔

جنوبی بھارت کی ریاست کیرالا میں قائم سول سوسائٹی تنظیم دی سینٹر فار مائیگریشن اینڈ انکلوزو ڈیولپمنٹ کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر بینوئے پیٹر نے نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن کی ایک دستاویز میں بتایا ہے کہ بھارت میں بہت بڑے پیمانے پر جبری مشقت لی جا رہی ہے مگر یہ پورا معاملہ بہت ڈھکا چھپا ہے۔ بینوئے پیٹر کے مطابق ملک بھر میں جبری مشقت جن لوگوں سے لی جا رہی ہے، اُن کی تعداد کم و بیش ۴۷ کروڑ ہے۔ اِن میں سے ۸ کروڑ منظّم شعبے میں ہیں۔ ۳۹ کروڑ کا تعلق غیر منظّم شعبے سے ہے۔

عالمی ادارۂ محنت نے انڈیا ایمپلائمنٹ رپورٹ برائے ۲۰۲۴ء میں لکھا کہ بھارت میں کمتر درجے کی ملازمتیں بہت زیادہ ہیں۔ لوگوں کو محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیا جاتا اور سہولتیں بھی برائے نام ہیں۔ غیر منظّم شعبے سے وابستہ افراد کا معاملہ بہت رُلا ہوا ہے۔ وہ انتہائی نوعیت کے جبر کے تحت کام

کر رہے ہیں۔ اُن کے لیے گزارے کی سطح برقرار رکھنا بھی ناممکن ہوتا جارہا ہے۔

۲۰۱۶ء میں بھارت کے وزیرِ محنت بنڈارو دتاتریہ نے پارلیمنٹ کو بتایا تھا کہ بھارت بھر میں باضابطہ بیگار یا جبری مشقت کے جال میں پھنسے ہوئے افراد کی تعداد ایک کروڑ ۸۴ لاکھ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حکومت انہیں ۲۰۳۰ء تک آزادی دلاکر بحال کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس حوالے سے اب تک کوئی باضابطہ کوشش دکھائی نہیں دی۔ ۲۰۲۱ء میں جب پارلیمنٹ کے رکن محمد جاوید نے استفسار کیا تو اُنہیں بتایا گیا کہ اب تک صرف بارہ ہزار بونڈیڈ لیبررز یعنی جبری مشقت کے بندھن میں بندھے ہوئے محنت کشوں کو آزاد کراکے بحالی کے عمل سے گزارا جاسکا ہے۔

بھارت میں ٹیکسٹائل کے شعبے میں حق تلفی اور ناانصافی سب سے زیادہ ہے۔ کیرالا اور گجرات سے ٹیکسٹائل کی برآمدات بہت زیادہ ہیں مگر پھر بھی محنت کشوں کو اُن کے حقوق نہیں ملتے۔ ان دونوں ریاستوں کی ٹیکسٹائل کی برآمدات ۱۲؍ارب ۸۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں۔

دی تامل ناڈو ٹیکسٹائل اینڈ کامن لیبر یونین کی صدر تھویا راکی کا کہنا ہے کہ انہوں نے ریاست کے متعدد علاقوں کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ بہت بڑے پیمانے پر جبری مشقت لی جارہی ہے۔ محنت کشوں کو ڈرایا دھمکایا بھی جاتا ہے۔ اُنہیں اجرت کے حصول میں بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بھارت میں ٹیکسٹائل کے شعبے سے وابستہ محنت کشوں کی تعداد ساڑھے چار کروڑ سے زائد ہے۔ ان میں ہینڈلوم چلانے والے ۳۵ لاکھ محنت کش بھی شامل ہیں۔

تھویا راکی کا کہنا ہے کہ ٹیکسٹائل کے شعبے میں جبری مشقت بہت وسیع پیمانے پر اور ڈھکی چھپی ہے۔ برآمدی شعبے کے ٹیکسٹائل یونٹس میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس حوالے سے کیے جانے والے سرکاری اقدامات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ گارمنٹ فورس میں ۶۰ سے ۸۰ فیصد خواتین ہیں۔ اِن کی بھی بہت بڑے پیمانے پر حق تلفی کی جاتی ہے۔ نچلی ذات کے ہندوؤں اور آبائی علاقوں کو چھوڑ کر آنے والی خواتین کا استحصال زیادہ کیا جاتا ہے۔

محنت کشوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں تنظیم ٹرانسپیرنٹیم کا کہنا ہے کہ کئی شعبوں میں جبری مشقت بہت بڑے پیمانے پر لی جارہی ہے اور متعلقہ حکومتی مشینری اس حوالے سے بالکل خاموش ہے۔ جن کی حق تلفی ہورہی ہے اُن کی فریاد سُننے والا کوئی نہیں۔ وہ روتے ہی رہ جاتے ہیں اور اُنہیں اُن کے حقوق نہیں ملتے۔

ایسا نہیں ہے کہ حکومت قوانین وضع اور نافذ نہیں کرتی۔ مختلف کیٹیگریز کے تحت لیبر لاز نافذ کیے جاتے رہے ہیں مگر مسئلہ نفاذ کا ہے۔ متعلقہ حکومتی مشینری قوانین کے نفاذ کی نگرانی نہیں کرتی۔ اس حوالے سے کرپشن بھی بہت زیادہ ہے۔ سرکاری مشینری سے وابستہ افراد کی مٹھی گرم کرکے صنعتکار صاف چُھوٹ جاتے ہیں۔ یہ سرکاری افسران سب اچھا ہے کی رپورٹ آگے بڑھا دیتے ہیں۔ کئی ریاستوں نے بھی مرکزی حکومت سے تحریک پاکر محنت کشوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے قوانین کی ترمیم کی ہے مگر نفاذ کی سطح پر نیم دلی یا بے دلی دکھائی دیتی ہے۔

بھارت میں مزدور انجمنوں کا کردار خاصا کمزور اور نیم دلانہ ہے۔ ملک بھر میں محنت کشوں سے روا رکھی جانے والی زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے والی مزدور انجمنوں کی تعداد برائے نام ہے۔ احتجاج بھی نیم دلی سے کیا جاتا ہے۔ محنت کشوں کو اُن کے حقوق دلوانے کے حوالے سے جیسا جوش و خروش ہونا چاہیے، وہ دکھائی نہیں دیتا۔ اِس کے نتیجے میں آجر مزید شیر ہوکر کام کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُنہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔

بہت سے ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت نے قوانین میں جو ترامیم کی ہیں، اُن کا فائدہ محنت کشوں سے زیادہ آجروں کو پہنچا ہے۔ بھارت میں سرکاری مشینری اور کاروباری طبقے کے خوش گوار تعلقات اظہر من الشمس ہیں۔ بڑے کاروباری ادارے حکومتی شخصیات کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ میڈیا بھی اِن تعلقات کو خوب اچھی طرح پروموٹ کرتا ہے۔ عام آدمی کے ذہن میں یہ تاثر موجود ہے کہ اب جبکہ کاروباری طبقہ حکمرانوں سے پوری طرح مل گیا ہے، قوانین پر عمل نہیں کرایا جاسکتا اور محنت کشوں کو اُن کے حقوق نہیں مل سکتے۔

بھارت بھر میں مزدور انجمنوں کے قیام کی گنجائش کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ محنت کشوں کو متعلقہ سرکاری اداروں میں رجسٹر نہ کرانے کے نتیجے میں وہ کسی بھی حادثے کی صورت میں ہرجانے کے حقدار بھی نہیں ٹھہرتے۔ آجر اس بات کا پورا خیال رکھتے ہیں کہ اُن کے ملازمین اپنی انجمن قائم نہ کریں۔ وہ ملازمین کو چھوٹے چھوٹے فرضی اداروں کے تحت کام پر رکھتے ہیں۔ اِن اداروں کا سرکاری کاغذات میں کہیں ذکر یا وجود نہیں ہوتا۔

محنت کشوں کو قانونی امور میں معاونت فراہم کرنے والی ہیلپ لائن انڈیا لیبر لائن کے سنتوش پونیا کہتے ہیں کہ اگر محنت کشوں کو انجمن سازی سے روک دیا جائے تو اُن کے پاس اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کا کوئی بڑا پلیٹ فارم نہیں ہوتا۔ یوں اُن کے پاس استحصال کو برداشت کرتے رہنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

انڈین سپریم کورٹ میں لیبر قوانین کے حوالے سے پریکٹس کرنے والے سنجے گھوش کا کہنا ہے کہ محنت کشوں کی حق تلفی کا معاملہ بہت گہرا ہے۔ اس حوالے سے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ جبری مشقت محض نشاندہی سے ختم نہیں ہوسکتی۔ اِس کے لیے باضابطہ تحریک چلانا پڑے گی، آجروں پر دباؤ ڈالنا پڑے گا تاکہ وہ محنت کشوں کو اُن کے حقوق دینے کے بارے میں سوچیں۔ اس حوالے سے سول سوسائٹی کو کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ قوانین کے نفاذ کے حوالے سے بہت سی خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں جس کے باعث محنت کشوں کو اُن کے حقوق نہیں ملتے اور اس حوالے سے کام کرنے والوں کے لیے بھی مشکلات برقرار رہتی ہیں۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر حکومت ملازمت کے معقول مواقع پیدا کرنے میں یونہی سُستی کا مظاہرہ کرتی رہی تو ملک بھر میں جبری مشقت کا دائرہ وسعت اختیار کرتا رہے گا۔ لازم ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داری پوری کرے، متعلقہ مشینری کو متحرک کرے اور آجروں کو پابند کرے کہ اپنے تمام اجیروں کو اُن کے حقوق کے مطابق معاوضہ اور سہولتیں دیں۔

اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے سابق مشیر پرمود کمار کا کہنا ہے کہ نجی شعبے کی سرمایہ کاری گھٹی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بلاواسطہ بیرونی سرمایہ کاری کا گراف بھی گرا ہے۔ بھارتی معیشت کی شرحِ نمو برقرار رکھنے کی بنیادی ذمہ داری اب حکومت کے کاندھوں پر آ پڑی ہے اور اُسے بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنا پڑ رہی ہے۔ ملازمت کے مواقع پیدا کرنے پر بھی زیادہ یا خاطر خواہ حد تک توجہ نہیں دی جارہی۔ ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کا کام غیر رسمی یا غیر منظّم شعبے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ شعبہ اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق معاوضے دیتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں محنت کشوں کی بہت بڑے پیمانے پر حق تلفی ہورہی ہے۔ جبری مشقت بھی بڑھ رہی ہے اور محنت کشوں کی صحت و سلامتی کو نظر انداز کرنے کا رجحان بھی قوی سے قوی تر ہوتا جارہا ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

'Open prison': The forced labour driving India's $5 trillion economy dream.
("Al-Jazeera". June 7, 2025)

ایک افریقی سیاسی راک اسٹار کی تقریر

وسعت اللہ خان

اردو صحافت میں افریقا کا ذکر ہوتا بھی ہے تو انسانی اسمگلنگ، خانہ جنگی، قحط سالی اور پسماندگی کے حوالے سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھار منڈیلا، نکروما، لومبا یا سنکارا جیسے انقلابیوں کا مختصر ذکر بھی ہو جاتا ہے۔ مگر آج کا افریقا کیا سوچ رہا ہے اور وہاں کیا تبدیلیاں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ہم میں سے اکثر اس کی کھوج کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔

اس پس منظر میں ان دنوں سوشل میڈیا پر افریقی نوجوانوں کی آنکھ کا تارہ اگر کوئی ہے تو وہ ہے مغربی افریقا کے ملک برکینا فاسو کا فوجی صدر ۳۷ سالہ کیپٹن ابراہیم ترورے۔

۲۰۲۲ء میں سابق نوآبادیاتی طاقت فرانس کی حاشیہ بردار حکومت کا تختہ پلٹنے والے کیپٹن ترورے نے آتے ہی فرانسیسی فوجی اڈے بند کر دیے اور روس اور چین سے مراسم بڑھا لیے۔ وہ اب مغربی افریقی ممالک کا ایک علاقائی اتحاد بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ابراہیم ترورے نے گزشتہ ڈھائی برس کے دوران سونا نکالنے والی مغربی کمپنیوں سے برکینا فاسو کی حصہ داری کا مطالبہ منوایا۔ زرعی اصلاحات کیں۔ کیپٹن ترورے کی توپوں کا رخ اکثر عالمی مالیاتی اداروں اور نوآبادیاتی طاقتوں کی جانب رہتا ہے مگر آئی ایم ایف اور عالمی بینک بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ کیپٹن ترورے کے دور میں برکینا فاسو کی معیشت میں قدرے بہتری آئی اور غربت کی شرح بھی کم ہوئی ہے۔

کیپٹن ترورے بلا کے مقرر ہیں۔ ان دنوں ان کی ایک تقریر سوشل میڈیا پر وائرل ہے جو انہوں نے ہمسایہ ملک گھانا کے نئے صدر کی تقریبِ حلف برداری کے موقع پر کی۔ اس تقریب میں ۲۲ دیگر افریقی سربراہانِ مملکت بھی موجود تھے۔ اس خطاب میں ایسا بہت کچھ ہے جو آپ کو شاید اپنا اپنا سا لگے۔ لہٰذا میں کیپٹن ترورے کے اس خطاب کو پڑھیے اور اپنے بارے میں بھی سوچیے۔

''عزیز افریقیو! قوموں کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب خاموش رہنا منافقت کے برابر ہے۔ میرا نام کیپٹن ابراہیم ترورے ہے۔ میں مہذّب سفارتی زبان نہیں جانتا۔ میں ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے بورڈ رومز میں بسی خوشبو سے بھی ناواقف ہوں۔ نہ واشنگٹن کا تربیت یافتہ ہوں، نہ ہی جنیوا کے آداب جانتا ہوں۔ میں تو اُس محاذ پر ہوں جہاں میرے لوگ خونم خون ہیں۔ میں اس خطے کے لیے بول رہا ہوں جسے عشروں سے ساہوکاروں نے اپنی جیل سمجھا ہے۔

آج میں لرزتی آواز میں نہیں بلکہ صدیوں بھرے افریقی درد سے لبریز آواز میں مخاطب ہوں۔ طویل عرصے سے آئی ایم ایف بیمار معیشتوں کی دوا کر رہا ہے۔ مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ یہ دوا اکثر جان لیوا ثابت ہوئی ہے۔ بین الاقوامی قرضے مسکراتے معاہدوں میں لپٹے زہریلے تیر اور معاشی استحکام کے نام پر گلا دبانے کی کوشش ہیں۔ اصلاحات کا عملی مطلب غیر ملکی لیبارٹریوں میں تیار کردہ ماڈلز کی تابعداری ہے۔ مگر اب ہم اقتصادی بساط کے مہرے بننے پر تیار نہیں۔ افریقا کو جاگنے کے بعد سانس لینے کے لیے آپ کی اجازت درکار نہیں۔

کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں قرضوں کی تنسیخ کی بھیک مانگ رہا ہوں یا شرائط میں نرمی کی وکالت کر رہا ہوں۔ میں وہ بتانے کی جرأت کر رہا ہوں جو اکثر افریقی رہنما بتانے سے ہچکچاتے ہیں۔ ہمارے جواہرات سے مغرب کا خزانہ بھرتا رہے اور ہم ان کی شرائط پر ناچتے رہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم کسانوں کو اپاہج کرنے والی پالیسیوں اور نوجوانوں کو جنم بھومی چھوڑنے پر مجبور کرنے والی دُھن پر اور نہیں تھرکنا چاہتے۔ اچھی گورننس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اپنی قومی دولت بیرونی کمپنیوں کے مسکراتے مشیروں کے حوالے کر دی جائے۔

ہم ایک نیا مکالمہ چاہتے ہیں۔ ساہوکار اور مقروض کا نہیں بلکہ دو مساوی فریقوں کا مکالمہ۔ ابھرتا ہوا شعور ہمیں سمجھا رہا ہے کہ آپ جو قرضہ افریقا کو پیش کر رہے ہیں، وہ ترقی کا زینہ یا غربت پار کرانے والا پل نہیں بلکہ سوٹڈ بوٹڈ ہاتھوں میں اسپریڈ شیٹس کی شکل میں نئی زنجیر ہے۔ آپ جسے اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کہتے ہیں، ہم اسے اسٹرکچرل سزا کہتے ہیں۔ آپ جس شے کو مالیاتی نظم و ضبط کہتے ہیں، ہم اسے نسل در نسل محرومی کا تسلسل سمجھتے ہیں۔ آپ شراکت داری کی بات کرتے ہیں۔ مگر ایک شریک مسلسل منافع میں ہو اور دوسرا نڈھال، تو یہ شراکت داری نہیں لوٹ مار ہے۔

میرا سوال ہے کہ یورینیم، کوبالٹ اور زرخیز زمین سے مالا مال کوئی قوم آخر غریب کیسے ہو سکتی ہے؟ کیسے ایک براعظم پوری دنیا کی صنعت کو ایندھن فراہم کرتا ہو مگر اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے سے قاصر ہو؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس کا سبب ہماری بدانتظامی، بدعنوانی اور نااہلی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ افریقا ان ناسوروں کا مارا ہوا ہے۔ مگر ان میں سے متعدد زخم آپ کے ہاتھوں کی دَین ہیں، جو اَب ہمیں ان عِلّتوں کے علاج کے نام پر سود سے لتھڑے نسخے تھما رہے ہیں۔

میں بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی پاور پوائنٹ پریزنٹیشن والا دلکش قرضہ ہمارے گلی کوچوں میں کیا گل کھلا رہا ہے۔ ہمارے بچے موم بتی کی روشنی میں پڑھ رہے ہیں، کیونکہ بجلی کے نظام کو نجکاری کے نام پر غیر ملکی سرمایہ کاروں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ بجلی کے ایسے نرخ مانگ رہے ہیں جو ہمارے لوگوں کے بس سے باہر ہیں۔

ٹوٹے بستروں سے اَٹے اسپتال اینٹی بائیوٹک ادویات سے خالی ہیں۔ عورتیں دورانِ زچگی مر رہی ہیں، کیونکہ آپ کی شرط ہے کہ ہم عوامی صحت پر زیادہ نہ خرچ کریں۔ لاکھوں گریجویٹس کا کوئی مستقبل نہیں کیونکہ ملازمتیں پیدا کرنے والے شعبے بیچ دیے گئے یا آپ کی کھلی منڈی کی پالیسیوں تلے کچلے گئے۔

قرضوں کی واپسی کا آپ کا وضع کردہ منصوبہ حیات بخش نہیں بلکہ موت کا پروانہ ہے۔ آپ ہمیں پانچ سو ملین ڈالر تھما کر سالہا سال کی ری اسٹرکچرنگ فیس اس میں ڈال کے ہم سے دو بلین ڈالر وصول کرتے ہو۔ آپ کہتے ہو کہ معاہدے باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں۔ یہ کیسی باہمی رضامندی ہے کہ مریض خونم خون ہو اور صرف آپ کے پاس وہ دوا ہو جو آپ من مانی قیمت پر بیچیں۔

محترم آئی ایم ایف! یہ رضامندی نہیں، معاشی دھونس ہے۔ یہ ترقی نہیں تسلط ہے۔ یہ عالمگیریت نہیں، مالیاتی رسّوں سے مسلح نیا نوآبادیاتی نظام ہے۔ افریقیوں کی نئی نسل نابینا نہیں۔ ہماری ہی محنت سے بنی میز پر پڑے ہماری ہی روٹی کے چند ٹکڑے ہمیں ہی عطا کرنے پر ہم آپ کے شکر گزار نہیں ہو سکتے۔ ہم معاشی کارکردگی بہتر کرنے کے نام پر آپ کے فارمولوں پر تالیاں پیٹنے سے عاجز آ چکے ہیں۔ ہم اپنے نام پر لکھے جانے والے قرضے آپ کے ماہرین اور مشیروں کے ہاتھوں میں غائب ہونے اور پھر ان غائب قرضوں کے عوض اپنی آزادی کا سودا کرنے کو مزید تیار نہیں۔

افریقا آپ کا نہیں بلکہ آپ افریقا کے مقروض ہو۔ اس سونے کے مقروض ہو جو بھاری بھاری بوٹوں کے زور پر چھینا

گیا۔ ان معدنیات کے مقروض ہو جو آپ کے اسمارٹ فون کو روشن رکھتی ہیں، جبکہ ہمارے دیہات تاریکی جھیلتے ہیں۔ ان ہیروں کے مقروض ہو جن کی خاطر ہم لہولہان کیے جاتے ہیں۔

ہم خیرات نہیں انصاف مانگ رہے ہیں اور انصاف کا تقاضا ہے کہ قرضوں کے استحصالی ڈھانچے کو سدھارا جائے۔ انصاف کا مطلب ہمیں یہ جاننے کا حق ہے کہ آپ نے ہم سے کیا لیا اور ہم نے آپ سے کیا لیا۔ انصاف یہ ہے کہ ہمیں اپنا مالیاتی مستقبل وضع کرنے کی آزادی ہو۔ اگر یہ باتیں آپ کو چبھ رہی ہیں تو یہ اچھی علامت ہے۔ کیونکہ یہی وقت ہے کہ جو اس نظام سے مطمئن ہیں، ان سے دوبدو بات کی جائے۔

افریقا میں بہت سی ریاستیں اور بہت سے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ مگر خودمختاری کے بغیر آزادی وہم ہے۔ بظاہر آپ ہم پر حکمران نہیں مگر ہمارا بجٹ آپ بناتے ہو۔ آپ ہمارے انتخابات میں ووٹ نہیں ڈالتے مگر یہ فیصلہ آپ کرتے ہو کہ ہماری معیشت ڈھ جائے یا سانس لیتی رہے۔ آپ ہمارے اندرونی معاملات میں غیر جانبداری کا دعویٰ کرتے ہو لیکن آپ کے ہی قلم کی روشنائی ہمارے قوانین لکھتی ہے۔ آپ ہمارے منتخب رہنماؤں کو ان کی حدود بتاتے رہتے ہو۔ یہ مدد نہیں سیاسی انجینئرنگ ہے۔

آپ بظاہر بموں کے بجائے بریف کیسوں اور ڈرائنگز سے مسلح آتے ہو مگر نقصان اتنا ہی پہنچاتے ہو۔ ٹیکنیکل زبان میں لپٹی آپ کی شرائط ایک سائلنسر لگی بندوق ہیں۔ آپ کے سفارشاتی احکامات بہت دلکش ہیں۔ سبسڈیز میں تخفیف کرو، منڈیاں کھولو، کرنسی کی قدر میں کمی کرو۔

مگر یہ کیسی سفارشات ہیں جن سے انکار کی قیمت بھک مری ہے۔ یہ کیسی تجویز ہے جس کی تابعداری پر ہی اگلے قرضے کا دار و مدار ہے۔ یہ بات ہم کب تک چھپائیں کہ آپ ہمارے اندرونی معاملات میں مکمل دخیل ہو۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ کفایت شِعاری سے کرپشن ختم ہو جائے گی مگر یہ اُمید ختم کر رہی ہے۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ کھلی منڈی ہمیں اوپر لے جائے گی مگر اس سے پیدا ہونے والی دولت سمندر پار منتقل ہو رہی ہے۔ اور جب ہمارے لوگ احتجاج کرتے ہیں تو آپ بالکل لاتعلق ہو کر کہتے ہو کہ ہم تو بس مبصر ہیں۔ تاریخ سب تماشا دیکھ رہی ہے۔''

میرے افریقو! گھانا تا زیمبیا اور سینیگال تا کینیا ایک ہی ڈرامہ چل رہا ہے۔ حکومتوں کو پانی کی نجکاری پر مجبور کیا جاتا ہے تا کہ غیر ملکی کمپنیاں منافع کما سکیں۔ سستی درآمدات کے ذریعے کسانوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ مقامی صنعتوں پر پھلنے سے پہلے ہی قاتلانہ حملہ ہو جاتا ہے۔ مشورہ دیا جاتا ہے کہ بجٹ کو متوازن بنانے کے لیے ترقیاتی بجٹ کم کریں تا کہ غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی بروقت ہو سکے۔

عجیب بات ہے کہ یہ ادائیگی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہم اس کے خلاف مزاحمت کی جرأت کریں، آپ کے تجویز کردہ نسخوں پر سوال اٹھائیں یا تجاویز نہ مانیں تو ہم بلیک لسٹ ہو جاتے ہیں، ہماری کریڈٹ ریٹنگ نیچے آ جاتی ہے، ہماری کرنسی کی قدر پر حملہ ہوتا ہے اور ہمارے رہنماؤں کو نام نہاد بین الاقوامی میڈیا انتہا پسند، سنکی اور پاپولسٹ قرار دے کر مطعون کرتا ہے۔

اس سے بڑی انتہا پسندی کیا ہوگی کہ ایک ملک کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے عوام کا پیٹ بھرنے سے پہلے قرض کا سود چکانے کی فکر کرے۔ چنانچہ ہماری نئی نسل کا اپنے روزگاری مستقبل اور سیاست پر سے ایمان اٹھتا جا رہا ہے کیونکہ ان کی قیادت عوام کو جواب دینے سے پہلے بینکوں کو جوابدہ ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ آپ ہمارے خوابوں کو بھی ویٹو کرتے ہو۔ آپ افریقی پالیسی بنانے والے غیر منتخب گورنر ہو۔ ہم کب تک برداشت کریں کہ ہمیں ہی دیے گئے قرضوں سے بھاری مشاہرہ پانے والے بین الاقوامی مشیر ہماری پالیسیاں بنائیں جب کہ ہمارے اساتذہ کو تنخواہ کے لالے پڑے ہوں۔ ہم ان اداروں کے آگے مزید کیوں جھکیں جو ہمارے شہریوں کے بجائے اپنے شیئر ہولڈرز کو جوابدہ ہوں۔

میں آئی ایم ایف سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنا اقتدارِ اعلیٰ واپس لینا چاہتے ہیں، بھلے اس کا مطلب آپ کے قرضوں کے بغیر ہماری شرحِ ترقی میں سست رفتار اضافہ ہی کیوں نہ ہو مگر تب یہ ہماری شرحِ ترقی ہوگی۔ وقتی تکلیف تو ہوگی مگر یہ آزاد ہونے کا درد ہوگا۔ افریقا کو آقا نہیں، شراکت دار چاہئیں۔

ہم اس نظام میں پیدا ہوئے ہیں جو ہم نے نہیں بنایا۔ یہ نظام معاہدوں، من مانے قوانین اور اداروں کا جال ہے۔ جب نوآبادکار رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے شفافیت کے بجائے ایسا نظام چھوڑ گئے جو انہیں مسلسل فائدہ پہنچاتا رہے۔

مسئلہ صرف آئی ایم ایف میں اصلاحات کا نہیں بلکہ تجارتی، مالیاتی، قرضہ جاتی قوانین کے ڈھانچے میں سدھار کا ہے۔ موجودہ مالیاتی ڈھانچا خدائی یا فطری منصوبہ نہیں بلکہ طاقتور انسانوں کا مسلط کردہ ہے۔ وہی طاقتور تعین کرتے ہیں کہ کس شے کی کیا قیمت ہو اور کسے ملنی چاہیے۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا براعظم جس کی ساٹھ فیصد زمین زرخیز ہے، اب تک خوراک میں خودکفیل کیوں نہیں؟ ہم سونے، ہیروں، تیل اور لیتھیم کے ذخائر پر بیٹھنے کے باوجود بھی محتاج کیوں ہیں؟ کیونکہ کھیل کبھی شفاف نہیں تھا۔

ہمیں صنعتی مصنوعات بنانے کے بجائے خام مال پیدا کرنے والے خطے میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہمیں عالمی معیشت میں ایک مخصوص کردار دیا گیا جیسے کسی کھیل میں اداکار کو دیا جاتا ہے۔ یعنی تم صرف اگاؤ گے، پروسیسنگ ہم کریں گے، تم ہاتھ پھیلاؤ گے ہم قرضہ دیں گے۔ جب بھی ہم اس کھیل کا اسکرپٹ دوبارہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو جرمانہ بھرنا پڑتا ہے۔ کریڈٹ ایجنسیز ہماری ریٹنگز گھٹا دیتی ہیں، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی لابی پابندیوں کی دھمکی دیتی ہے، ہائی ٹیک کمپنیاں اپنا سرمایہ نکال لیتی ہیں۔ آپ کا میڈیا ہمیں پاگل کہتا ہے۔

مگر اس سے زیادہ غیر مستحکم دنیا اور کیا ہوگی کہ ۴؍ارب انسانوں کا براعظم ماحولیات کی ابتری میں سب سے کم اور اس کے نقصانات میں سب سے زیادہ حصہ دار ہے۔ اس سے زیادہ غیر منطقی کیا ہوگا کہ پوری دنیا کے لیے کوکا اگانے والے کسان خود اپنے بچوں کے لیے چاکلیٹ خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس سے بڑی ناانصافی کیا ہوگی کہ جن ممالک نے ہمیں ماضی میں نوآبادی بنایا، آج وہی ہمیں گڈ گورننس کا لیکچر دے رہے ہیں اور دوسری جانب افریقی اشرافیہ کی چرائی ہوئی دولت بنا کوئی سوال پوچھے اپنے بینکوں میں رکھ رہے ہیں۔ اور وہ اس نظام کو میریٹوکریسی بھی کہتے ہیں۔

وہ ہم سے کہتے ہیں کہ محنت کرو، شفاف بنو اور مزید سرمایہ کاری کے مواقع بڑھاؤ۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ عالمی تجارتی قوانین کبھی بھی شفاف نہیں رہے۔ عالمی ادارہِ تجارت (ڈبلیو ٹی او) عالمی بینک اور آئی ایم ایف جیسے ریفریز انہیں ٹیموں کے طرفدار ہیں جو ہمیشہ جیتتی ہیں۔

مثلاً جب ہم نے اپنے کسانوں کو سبسڈی دینے کی کوشش کی تو ہمیں کہا گیا کہ اس سے کھلی مارکیٹ پر منفی اثر پڑے گا۔ مگر امریکا اور یورپ اپنے کسانوں کو اربوں ڈالر کی سبسڈی دے رہے ہیں اور اسے تحفظ کا نام دیتے ہیں۔ جب ہم نے روزگار پیدا کرنے کے لیے سرکاری شعبے میں صنعتیں لگانے کی کوشش کی تو ہمیں بتایا گیا کہ اس سے معاشی جمود بڑھے گا۔ جبکہ ان کی امیر ترین نجی کارپوریشنز سرکاری پیسے سے چلنے والے ناسا، سرکاری جنگوں، سرکاری ٹھیکوں اور سرکاری ریسرچ اداروں کی تحقیق سے پورا تجارتی فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ جب ہم کانکنی کے استحصالی معاہدوں پر نظرِ ثانی کی بات کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے

کہ ہم کاروبار دشمن ہیں۔ مگر اس سے بڑی دشمنی کیا ہوگی کہ آپ سوڈالرمالیت کی معدنیات نکالیں اور ہمیں تین ڈالر رائلٹی دے کر چلتے بنیں۔

افریقا آپ سے رحم کھانے کو نہیں کہہ رہا۔ ہم صرف شفافیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم خیراتی اترن نہیں برابری چاہتے ہیں۔ ہم اس کرۂ ارض کا سب سے توانا براعظم ہیں۔ مگر عالمی معیشت ہم سے ایسا سلوک کر رہی ہے جیسے ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں۔ ہمارے مزدور، ہماری زمین، ہماری اقدار ناقص نہیں بلکہ نظام ناقص ہے۔ ہم آپ سے تعلق نہیں توڑنا چاہتے مگر مزید زنجیریں پہننے کو تیار نہیں۔

ہم سنکارا، نکروما، لومبا اور منڈیلا کے بچے ہیں۔ محض زندہ رہنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے اب ہمیں کسی کی اجازت اور افریقا کو اب کوئی نیا نجات دھندہ یا تازہ لیکچر یا جکڑ بند قرضہ نہیں چاہیے۔ ہم خود کو تمہارے برابر تسلیم کروانے کے لیے خوشامد نہیں کریں گے۔ ہم شراکت داری کے خلاف نہیں مگر ہم اس کی شرائط ازسرِنو ترتیب دینا چاہتے ہیں۔

کوئی ملک بااختیار نہیں کہلا سکتا اگر اپنے لوگوں کا پیٹ نہ بھر سکے۔ ہم کیسے آزاد کہلا سکتے ہیں جب کسی جگہ پڑنے والا قحط ہماری روٹی کی قیمت طے کرے۔ نوآبادیاتی نظام نے جو سب سے خطرناک ترکہ چھوڑا، وہ بندوق نہیں بلکہ نصاب ہے۔ ایسا نصاب جو ہمیں غیرملکی بادشاہوں کے بارے میں تو خوب بتاتا ہے مگر ہمارے ہیروز کو نظرانداز کرتا ہے۔ نصاب میں غیرملکی فلسفیوں کی تعریف ہے مگر افریقی دانش کا ذکر غائب ہے۔

ہمیں تعلیمی نصاب دوبارہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے بچے اپنی قدر و قیمت سے آگاہ ہوسکیں۔ اپنی تاریخ پر فخر کرسکیں اور اعتماد کے ساتھ تخلیقی قوت استعمال کرسکیں۔ بچوں کو کوڈنگ ضرور سکھائیں مگر علمِ زراعت بھی پڑھائیں۔ ہمارے اسکول آزادی کی لیبارٹری ہونے چاہئیں۔ تعلیم محض امتحان میں کامیابی تک محدود نہ ہو بلکہ اپنی قسمت خود تعمیر کرنے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا جو خام مال باہر جاتا ہے، وہی خام مال کھلی تیار مصنوعات کی شکل میں دس گنا قیمت پر ہمیں لوٹایا جاتا ہے۔ ہمیں مقامی صنعت کاری اور ایجاد پسندی کی جانب آنا ہوگا۔ صرف معدنیات کی ملکیت کافی نہیں۔ منافع کمانے کے لیے ہمیں دھاتوں کی ریفائننگ اور پیکیجنگ کی اپنی صنعت چاہیے۔ ہمیں افریقی سرمایہ کاری اور نوزائیدہ صنعتوں کو تحفظ دینا ہوگا اور غیرضروری اشیا کی درآمدی عادت کو کم کرنا ہوگا۔ یہی ایک طریقہ ہے روزگار پیدا کرنے اور افریقا کی دولت افریقیوں کے لیے استعمال کرنے کا۔ منقسم افریقا ہمیشہ کمزور رہے گا۔ ہم ۵۴ ممالک الگ الگ آوازوں کی شکل میں دنیا سے اجتماعی سودے بازی نہیں کرسکتے۔ ہمیں سیاسی، اقتصادی، دفاعی اور سائنسی تعاون کے لیے متحد ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے بین الافریقا ادارہ سازی کرنا ہوگی۔ ہم تب تک آزاد نہیں ہوسکتے جب تک مقامی دانش پر بھروسا کرنا نہیں سیکھیں گے۔

پیارے افریقیو! خودکفالت کا مطلب مغرب کی نقالی ہرگز نہیں۔ خودکفالت کے سفر میں ہم سے غلطیاں بھی ہوں گی، ہم لڑکھڑائیں گے بھی۔ مگر وہ ہماری اپنی غلطیاں ہوں گی۔ انہی سے ہمیں سیکھنے کا موقع ملے گا۔ کوئی نجات دھندہ نہیں آئے گا۔ نجات دھندہ یہیں موجود ہے اور وہ ہم ہیں۔ لہٰذا لاحاصل انتظار اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ اب رک جانا چاہیے۔ صرف باتوں اور دعوؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں آج ہی سے اپنے ہاتھ مٹی سے آلودہ کرنے ہوں گے۔ قلم کی روشنائی بھلے کتابوں پر گرتی ہے تو گرنے دو۔

اے عام افریقیو! تم بےبس نہیں۔ بس تمہیں اب تک یہ جتایا گیا کہ طاقتور وہ ہے جو سوٹ پہن کر مائیکروفون لیے کھڑا ہوتا ہے اور مستقبل کا فیصلہ دور کہیں عالیشان عمارات میں بیٹھنے والے ہی کرتے ہیں۔ مگر تم جان لو کہ اختیار کا سفر اوپر سے نیچے نہیں بلکہ نیچے سے اوپر ہوتا ہے۔ افریقا کی اصل طاقت اس کسان کے پاس ہے جو علی الصبح بیدار ہوتا ہے۔ اس ماں کے پاس ہے جو اپنی خواہشات اپنے بچے کی ضروریات پر قربان کر دیتی ہے۔ طاقتور وہ لڑکا ہے جو بھوکا ہونے کے باوجود چوری نہیں کرتا۔ طاقت اس بچی کے پاس ہے جو روزانہ پانچ میل چل کے اسکول جاتی ہے۔ ٹھیلے والا، مکینک، نرس، ماشکی، استاد۔ یہ ہیں ہماری طاقت۔ افریقا انہی کے سہارے تو رواں ہے۔

خود کو عام سے لوگ سمجھنے والے یہی انسان تو دراصل نئے افریقا کے معمار ہیں۔ مگر انہیں یہی بتایا گیا ہے کہ تم بس تالی بجاؤ جب تمہاری طرف کوئی روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے پھینکے۔ صاحبانِ اختیار سے پوچھنے کے بجائے ان سے ڈرو۔ اس وقت بھی سوال نہ کرو جب صاحبانِ اختیار تمہیں بنیادی تحفظ نہ دے سکیں۔ ہمیں اس منحوس مُروّت اور اس نادیدہ دیوار سے جان چھڑانا ہوگی جو عوام کو لیڈر سے اور اشرافیہ کو عوامی رول ماڈلز سے الگ رکھتی ہے۔ اصل قیادت حکمران نہیں خدمت گزار ہوتی ہے۔ کوئی بھی نظام بغیر احتساب کے فسطائیت کے سوا کچھ نہیں۔

نظام آپ کو بےبس کیوں رکھنا چاہتا ہے؟ کیونکہ بین الاقوامی ادارے آپ کی خاموشی کے سبب ہی آپ کی ریاستوں کو کنٹرول کر پاتے ہیں۔ ان کی خوشحالی آپ کی مزاحمت کی شکست میں پنہاں ہے۔ آپ صرف جسم و جان کا رشتہ نبھانے میں ہی اس قدر الجھا دیے جاتے ہیں کہ آپ متحد نہ ہوسکیں۔ اسی لیے آپ کو بتایا جاتا ہے کہ سیاست ایک گندہ کھیل ہے۔ یہ آپ کے لیے نہیں۔ اس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

مگر یہ جان لیں کہ ہرگرانی، ہر ناکارہ اسپتال، یہ سب سیاسی فیصلوں کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا فیصلہ سازی کے عمل سے خود کو لاتعلق رکھنا اور سوال نہ کرنا دراصل اپنی استحصالی قوتوں کو مسلسل سہولت فراہم کرنا ہے۔ جب لوگ جاگتے ہیں تب توازن بدلنا شروع ہوجاتا ہے۔ جب نوجوان خاموش رہنے سے انکار کر دیں، جب مائیں اختیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچ بولنے لگیں، جب بوڑھی آوازوں میں لرزش نہ رہے۔ تب کوئی آئی ایم ایف، کوئی آمر، کوئی کٹھ پتلی حکومت نہیں ٹک سکتی۔

ضروری نہیں کہ انقلاب ہمیشہ دبنگ انداز میں زمین ہلاتا ہوا آئے۔ بعض اوقات یہ دبے پاؤں بھی آجاتا ہے۔ مگر اس وقت جب ہر نوجوان اپنا ووٹ بنوائے۔ جب کارکن عورتیں رشوت دینے سے انکار کر دیں۔ جب ہمسائے سرکار کا انتظار کیے بغیر اپنی گلی کی خود ہی مرمت کرلیں۔ آپ کا فرض صرف مزاحمت کرنا ہی نہیں بلکہ اپنی مدد آپ کرنا بھی ہے۔ آپ صرف تماشائی نہیں، تماشے کا حصہ بھی ہیں۔ اس کے لیے کسی کی اجازت درکار نہیں۔ اپنی قسمت آپ خود ہی بدل سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا صرف آپ کی قسمت کے دام کھرے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اختیار تھالی میں نہیں ملتا۔ اسے کمانا پڑتا ہے۔ کیا آپ خود کو اس قابل بنا سکتے ہیں؟ یاد رکھیے! دنیا ہماری طاقت سے زیادہ ہمارے جاگنے سے خوفزدہ ہے۔

جاگنے سے روکنے کے لیے ہمیں مسلسل بتایا گیا کہ ہم غیرمہذب ہیں، پسماندگی ہماری رگوں میں ہے اور چلنے کے لیے بھی کسی کے سہارے اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔ یہ جھوٹ اتنے تواتر سے بولا گیا کہ ہم نے بھی اسے سچ جان کے یقین کرلیا اور جھکتے چلے گئے۔

ہمیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ انسانی تہذیب نے افریقا میں ہی جنم لیا تھا۔ سب سے پہلے ہمارے ہی بزرگوں نے ستاروں کو قطب نما کے طور پر استعمال کیا۔ انہی سے علمِ فلکیات، روحانیات، فنِ زراعت اور جڑی بوٹیوں کے طبی استعمال کا آغاز ہوا۔

////// باقی صفحہ نمبر ۶ \\\\\\

افغانستان، پہاڑوں کے سائے میں ایک دُنیا

محمود الحق صدیقی

افغانستان ایشیا کے دل میں واقع ایک ایسی سرزمین ہے جس کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ نے خوف اور دہشت کی جو تصویر دنیا کے سامنے رکھی ہے، وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

یہ ملک غیرت مند اور دین دار قوم کا مسکن ہے، جہاں عظمتِ اسلام کے آثار، شہداء کے لہو کی خوشبو اور تہذیب و سادگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہاں کے باسی مہمان نوازی، سچائی اور ایمان داری میں اپنی مثال آپ ہیں۔

کراچی سے چمن بارڈر تک کا زمینی سفر

ہمارا سفر کراچی سے شروع ہوا۔ یہ ۱۶ گھنٹوں پر محیط ایک طویل مگر پُرامن اور یادگار سفر تھا، جو بس کے ذریعے طے ہوا۔ بلوچستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے دل میں اندیشے موجود تھے، مگر اللہ پر توکل نے خوف کو کمزور کر دیا۔ راستے بھر قدرتی مناظر اور دیہی زندگی کی سادگی نے سفر کو دلکش اور ہلکا پھلکا بنایا۔

چمن بارڈر پر صبر، حوصلے کا امتحان

چمن بارڈر پر پہنچتے ہی ایک نئے مرحلے کا آغاز ہوا۔ زمینی راستے کی مشقت اور سہولیات کی کمی نے سفر کو قدرے دشوار بنا دیا۔ حکام نے تفصیلی پوچھ گچھ کی، ایک لمحے کو یوں لگا کہ شاید داخلہ نہ ملے، لیکن اللہ نے آسانی فرمائی اور 'ایگزٹ اسٹیمپ' لگ گئی۔ افغانستان کی حدود میں داخل ہوتے ہی دل کو جو سکون اور طمانیت نصیب ہوئی، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

قندھار میں مہمان نوازی اور رہنمائی

قندھار میں ایک دکان دار نے نہایت خوش اخلاقی سے مہمان نوازی کی۔ وہاں نماز ادا کی، کرنسی تبدیل کروائی اور مقامی افراد سے مفید مشورے ملے۔ ان کی محبت، خلوص اور رہنمائی نے یہ یقین دلا دیا کہ میں ایک امن پسند اور دین دار قوم کے درمیان موجود ہوں۔

قندھار سے کابل ۶۰۰ کلومیٹر کا سفر

قندھار سے کابل تک پہاڑوں کے درمیان کا سفر ایک کار کے ذریعے طے کیا، جو تقریباً ۶۰۰ کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ قندھار، پکتیکا اور غزنی سے ہوتے ہوئے رات گئے کابل پہنچا۔

چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں نے سفر کو دلکش بنا دیا۔ کئی مقامات پر شہداء کے ناموں والے پتھر نظر آئے، جو قربانی اور وفاداری کی زندہ علامت تھے۔

راستے میں مختلف مقامات پر طالبان حکام نے چیکنگ کی، دستاویزات دیکھے اور ایک جگہ پاسپورٹ کی تصویر بھی لی۔ ان کا انداز باوقار اور منظم تھا لیکن پاکستان کے حوالے سے ان کے دلوں میں تحفظات بہرحال موجود ہیں۔

راستے میں نماز، سادگی کا روح پرور منظر

راستے بھر نماز کے اوقات میں لوگ سڑک کے کنارے انفرادی اور جماعت کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے نظر آئے۔ یہ روح پرور مناظر اس بات کا ثبوت تھے کہ دین یہاں زندگی کا بنیادی ستون ہے۔ ایک دلچسپ منظر تب دیکھنے کو ملا جب ہمارا ڈرائیور، جو باریش اور نمازی تھا، نماز کے فوراً بعد چرس پینے لگا۔ جب میں نے کہا: ''امارتِ اسلامی میں چرس؟'' تو اس نے مسکرا کر جواب دیا: ''یار، تھوڑا بہت تو چلتا ہے!''۔ یہ ایک تلخ مگر سچائی پر مبنی سماجی تضاد کی مثال تھی۔

کابل میں تاریخی، دینی اور علمی مقامات کا مشاہدہ

کابل پہنچ کر کئی مقامات کی زیارت کی جن میں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کا مقبرہ اور کابل یونیورسٹی شامل تھی۔ یونیورسٹی میں داخلہ نہ مل سکا، لیکن مرکزی دروازے پر کچھ طلبہ سے گفتگو ہوئی۔

دعوت یونیورسٹی

دعوت یونیورسٹی نجی سطح پر افغانستان کی بڑی جامعات میں سے ایک ہے، یہاں کے اساتذہ برادر نوید اور مصطفیٰ غیور سے جامعہ اور افغانستان کی تعلیمی صورتحال کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔

افغانستان میں مسجد حاجی عبدالرحمٰن، مسجد و مزار دوشاہ دو شمشیرہ، نیشنل آرٹ اینڈ ہسٹری میوزیم اور کئی دیگر ادارے دیکھنے کا ارادہ تھا مگر سکیورٹی اور مقامی مشوروں کے باعث رکنا پڑا۔

جلال آباد یونیورسٹی اور مدرسہ جامعۃ الراشد کا دورہ

جلال آباد (ننگرہار یونیورسٹی) حکومتی سطح پر افغانستان کی دوسری بڑی جامعہ ہے، یہاں برادر ڈاکٹر الفت اللہ (ڈاکٹر الفت اللہ نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے عربی میں پی ایچ ڈی مکمل کی ہے) نے مہمان نوازی کی۔ کلیہ لسانیات کے سربراہ اور اساتذہ سے بھی بہت اچھی ملاقات اور گفتگو رہی۔ اس فیکلٹی کے اکثر اساتذہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے فارغ التحصیل ہیں۔

مدرسہ جامعۃ الراشد کے شیخ الحدیث اور مہتمم مولانا نیک محمد صدیقی اور مولانا امان اللہ راشدی سے جامعہ سے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی۔

مولانا نیک محمد صدیقی، مولانا گوہر رحمٰنؒ کے شاگرد ہیں اور افغان جہاد کے بانیوں میں سے ہیں۔

یہ جامعہ کنڑ سے قریب واقع ہے، یہاں مقامی طلبہ کی ایک بڑی تعداد تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ مدرسے کو مالی اعتبار سے شدید مشکلات کا سامنا ہے۔

افغانستان کے سماجی اور سیاسی حالات کا مختصر جائزہ

الحمدللہ! افغانستان اس وقت استحکام کی جانب گامزن ہے۔ طالبان کی حکومت منظم، بااختیار اور فعال ہے۔ عوام دین دار، غیرت مند اور مہمان نواز ہیں اور سیکورٹی کی صورتحال مثالی ہے۔ بے حیائی، جرائم اور خرافات تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔

خواتین کی تعلیم (چھٹی جماعت سے آگے) اور ملازمت پر پابندی افسوسناک ہے۔ فلسطین و غزہ کے مسائل پر عمومی بے حسی محسوس ہوئی۔ ملک میں مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے، مگر ترقیاتی کام بھی جاری ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بہتری آ رہی ہے، لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہجرت ایک چیلنج ہے۔ ملک میں غیر ملکی این جی اوز پر پابندی ہے۔ طالبان کے سابقہ ادوار کے مقابلے میں زیادہ لچک نظر آتی ہے۔ بے روزگاری اور مہنگائی کے عفریت نے مشکلات میں اضافہ کر دیا ہے۔

پاکستان سے متعلق طالبان میں کچھ تناؤ اور خدشات محسوس ہوئے۔ دونوں برادر اسلامی ملک کو سفارتی سطح پر اپنے تحفظات دور کرنے چاہئیں اور اُخوت پر مبنی مثالی تعلقات کو فروغ دینا چاہیے۔

سفر کا اختتام

یہ سفر صرف جغرافیائی سرحدوں کو عبور کرنے کا نام نہیں تھا، بلکہ ایک نظریاتی، فکری اور روحانی بیداری کا ذریعہ بنا۔ افغانستان کی تصویر وہ نہیں جو میڈیا دکھاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک پُرامن، مہذب، دینی اقدار سے جڑا معاشرہ ہے۔

دعا ہے کہ افغانستان مکمل امن، خوشحالی اور انصاف کا گہوارہ بنے۔ طالبان کو اعتدال، فراخ دلی اور حکمت میسر آئے۔ یہ سفر ختم ہوا، مگر دل کی دنیا میں ایک نئی روشنی، امنگ چھوڑ گیا۔

شاہراہِ زوال کا راہی

Stephan Richter

یہ حقیقت سمجھنے میں بہت سے لوگ شدید غلطی کر جاتے ہیں کہ کوئی بھی ملک چاہے جتنی بھی ترقی کر لے، پہلے انحطاط پذیر ہوتا ہے اور پھر زوال سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسا بالعموم اِس لیے ہوتا ہے کہ انتہائی قابلِ رشک نوعیت کی ترقی اور خوشحالی ممکن بنا لینے کے بعد یہ ممالک بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ انسان جب بہت کچھ پالیتا ہے تو اپنے حقوق پر بہت زور دیتا ہے مگر فرائض بھول جاتا ہے۔ وہ پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں دوسرے بھی ہیں جن کے ہاتھ میں اور وہ بھی پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وائمر کے دور میں جرمنی غیر معمولی بلکہ قابلِ رشک ترقی کا مظہر اور طاقت کا حامل تھا۔ آج امریکا بھی بہت سے معاملات میں قابلِ رشک ہے مگر اس حقیقت کو سب نے بھلا دیا ہے کہ اگر انتباہی علامات نظر انداز کر دی جائیں تو دنیا کے لیے مثال بننے والی ترقی کے حامل ممالک بھی بہت تیزی سے انحطاط کا شکار ہو سکتے ہیں اور پھر اُن کا مکمل زوال کوئی روک نہیں سکتا۔

۲۰۱۷ء اور ۲۰۲۰ء کے دوران یعنی ڈونلڈ ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت میں جب بھی امریکی دوست برلن آتے تھے تو میں اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر ''آزاد دنیا میں آپ کا خیر مقدم ہے'' کہتے ہوئے اُن کا استقبال کرتا تھا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ دیوارِ برلن گرانے اور مشرقی و مغربی جرمنی کو دوبارہ ایک کرنے میں امریکی سفارت کاری اور عسکری قوت نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اور بعد میں بھی برلن والوں کی آزادی کو برقرار رکھنے میں اُس کا کردار اہم رہا تھا۔

مگر پھر بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ ڈونلڈ ٹرمپ آ گئے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے دوبارہ امریکی ایوانِ صدر میں قدم رکھا ہے اور دنیا بھر میں بہت کچھ الٹ، پلٹ رہا ہے۔ میں اب بھی امریکا سے آنے والوں کا خیر مقدم اِنہی الفاظ کے ساتھ کرتا ہوں مگر اب تناظر بدل چکا ہے، ماحول کچھ اور ہے۔ الفاظ وہی ہیں مگر اُن کا اثر اور تاثر یکسر مختلف ہے۔ ایک عشرے کے دوران دنیا بہت بدل گئی ہے۔ بہت کچھ مٹ رہا ہے اور بہت کچھ تیزی سے منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ بڑی طاقتوں کے لیے بھی یہ وقت مشکلات سے بھرا پڑا ہے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر دنیا کی مشکلات کو رونے کا وقت گیا۔ اب سبھی ایک کشتی کے سوار ہے۔ جن کی جیبیں اور تجوریاں بھری ہوئی ہیں، وہ بھی پریشان ہیں۔ قابلِ رشک ترقی بھی انسان کو سکون نہیں دے رہی۔

میں نے جب عشروں قبل جرمنی چھوڑ کر امریکا میں مستقل سکونت اختیار کی تھی تب میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند عشروں میں دنیا اِتنی بدل جائے گی۔ میں نے حال ہی میں سیبیسٹین ہیفنر کی کتاب ''میموئرز آف اے جرمن'' پڑھی تو حیران رہ گیا۔ اُن کی بصیرت کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

سیبیسٹین ہیفنر نازیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے دور میں طالبِ علم تھے۔ جب نازیوں نے جرمنی کو اپنے ہاتھ میں لیا تب سیبیسٹین ہیفنر برلن کے لا اسکول کے گریجویٹ تھے۔ دوسرے بہت سے جرمن باشندوں کی طرح ہیفنر کو بھی جان بچانے کے لیے جرمنی سے بھاگنا پڑا۔ وہ لندن گئے اور بعد میں ایک بڑے مصنف کے طور پر ابھرے۔ اُنہوں نے ۱۹۷۹ء میں ''دامینگ آف ہٹلر'' لکھی جس نے عالمگیر شہرت پائی۔

روزمرہ زندگی میں سرایت

ہیفنر نے لکھا ہے کہ میں جب جرمنی میں اسکول کی سطح پر تعلیم حاصل کر رہا تھا تب بہت سی ایسی تصویریں دیکھ چکا تھا جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کس طور نازی فوجوں نے برلن کی سڑکوں پر مارچ کیا ہوگا اور کس طور اپنی طاقت منوائی ہوگی۔ روزمرہ زندگی میں نازیوں کے اثرات کا دائرہ وسیع کرنے کے عمل کے بارے میں ہیفنر نے بہت عمدگی سے لکھا ہے۔ تب جرمنی فقید المثال ترقی سے ہم کنار تھا۔ فطری علوم و فنون، فنونِ لطیفہ اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے جرمنی بہت تیزی سے مستحکم تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ تب تک تھا جب تک عسکری قوت بننے کا خبط پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب نازی اِزم آیا اور نازیوں نے اقتدار پر قبضہ کیا تو صرف طاقت کا اظہار ہی سب کچھ ہو گیا۔ نازی جرمنی زیادہ سے زیادہ توسیع چاہتا تھا۔ وہ خطے کے تمام ممالک کو ہڑپ کرنے کے فراق میں تھا۔ حد یہ ہے کہ اُس نے روس کو بھی زیرِ نگیں کرنے اور رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ فرانس کا جو حشر ہوا وہ تو دنیا نے دیکھا۔ نازی جرمنی نے قدم بڑھایا اور فرانسیسیوں نے بہ رضا و رغبت ہتھیار ڈال دیے۔

جرمنی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک مطلع العنان حکمران نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دنیا نے دیکھا کہ جرمنی کی ترقی کا سفر رُک گیا۔ جو جرمنی دنیا کے لیے ترقی و خوشحالی اور تہذیب و ثقافت کا نمونہ بنتا جا رہا تھا، وہ محض عسکری قوت بن کر رہ گیا۔

ایسے تماشے دنیا بھر میں ہوتے رہے ہیں۔ جب بھی کوئی مطلق العنان آمر کسی ریاست کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو اپنے اقتدار کو طُول دیتے رہنے کے لیے طاقت کا بے محابا استعمال یقینی بناتا ہے۔

میں جب ہیفنر کی کتاب پڑھ رہا تھا تب مجھ پر بہت کچھ کُھلتا چلا گیا۔ دنیا بھر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اچھی طرح سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ میں نے پڑھا کہ جب تک نازیوں نے جرمنی میں اقتدار پر قبضہ نہیں کیا تھا تب تک جرمنی بھرپور ترقی کی منزلیں مار رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی معاملہ ٹرمپ کا بھی ہے۔ جنوری ۲۰۲۵ء میں ٹرمپ کے دوبارہ صدر بننے تک امریکا جو کچھ کر رہا تھا، اُس سے اب بہت دور ہو چکا ہے۔ ٹرمپ کی ایوانِ صدر میں دوبارہ آمد سے قبل تک امریکا میں سول سوسائٹی بہت مضبوط تھی۔ اظہارِ رائے کا معاملہ بہت اچھا تھا مگر اب بہت کچھ داؤ پر لگتا دکھائی دے رہا ہے۔ امریکی معاشرے میں انتہائی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ امریکی قیادت ایک بار پھر مشرقِ وسطیٰ میں الجھ رہی ہے۔ طاقت کے استعمال کو ایک بار پھر غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے۔ عالمی سطح پر امریکا کو relevant رکھنے کے لیے امریکی قیادت طاقت کے غیر معمولی استعمال کو سب سے بڑے ہتھکنڈے کا درجہ دے رہی ہے۔

دنیا کو اندازہ ہو چکا ہے کہ امریکی ایوانِ صدر میں ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ آمد کوئی اچھا شگون نہیں۔ امریکا نے اپنی فوج کو دنیا بھر میں اُتار رکھا ہے۔ اِس کے نتیجے میں امریکی معیشت پر دباؤ بھی بہت بڑھا ہے۔ امریکا میں بہت کچھ بدل رہا ہے۔ رائے عامہ بُری طرح منقسم ہے۔ عالمی سطح پر امریکا کی ساکھ بُری طرح مسخ ہو چکی ہے۔ امریکا نے اپنے دروازے بند کرنے کا عمل تیز کر دیا ہے۔ ویزا کی شرائط اور پابندیاں بہت بڑھا دی ہیں۔ ۹ دہائیوں پہلے کی بات ہے کہ جرمنی میں سخت گیر حکومت اچانک مطلق العنان نوعیت کی حکمرانی میں تبدیل ہوئی تھی اور ملک ٹھکانے لگ گیا تھا۔

امریکا کو بھی کچھ ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے۔

اب یہ بات بھی کُھل کر کہی جارہی ہے کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکا نے فطری علوم و فنون میں غیر معمولی رفتار سے پیشرفت اِس لیے ممکن بنائی تھی کہ نازیوں سے جان بچاکر فرار ہونے والے بیشتر جرمن یہودی سائنسدانوں نے امریکا کا رُخ کیا تھا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جرمنی کے بہترین ذہن امریکا کو مفت میں مل گئے تھے۔ جرمنی سے جان بچاکر امریکا میں سکونت اختیار کرنے والے اِن یہودی سائنسدانوں نے امریکا کو حقیقی معنوں میں سپر پاور بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

گزشتہ صدی کے ابتدائی نصف میں جس صورتحال کا سامنا جرمنی کو تھا، کچھ کچھ ایسی ہی صورتحال کا سامنا اب امریکا کو ہے۔ تب جرمنی سے سائنسدان بھاگے تھے، اب امریکا سے بھاگ رہے ہیں یا بھاگنے کے لیے پَر تول رہے ہیں۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جس طور نازیوں نے فطری علوم و فنون کی ترویج روکی تھی اور تحقیق کی راہ میں دیواریں کھڑی کی تھیں، بالکل اُسی طرح اب ٹرمپ انتظامیہ نے امریکا میں فطری علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی راہ میں روڑے اٹکانا شروع کردیے ہیں۔ تحقیق کے لیے کی جانے والی فنڈنگ میں انتہائی درجے کی کمی واقع ہوچکی ہے۔ معاشرے کی بہتری کے لیے سرکاری سطح پر جو فنڈنگ اب تک کی جاتی رہی ہے، اُس میں بھی پریشان کن حد تک کمی واقع ہوتی ہے۔ امریکا میں اب تک خانہ جنگی کی کیفیت تو پیدا نہیں ہوئی مگر شہریوں کی آزادی سلب کی جارہی ہے، مختلف بنیادوں پر نفرت کو ہوا دی جارہی ہے۔ تارکینِ وطن کی آمد روک کر امریکا میں موجود اور بسے ہوئے تارکینِ وطن کے خلاف فضا تیار کی جارہی ہے۔

بہت کچھ ہے جو بہت سی کہانیاں سُنا رہا ہے مگر امریکی قیادت کچھ سُننے، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ امریکی معاشرہ تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور مکمل زوال کی طرف اُس کا سفر تیز ہوگیا ہے مگر بہت سی واضح علامات کو بھی امریکی قیادت یکسر نظرانداز کررہی ہے۔

یہ نکتہ کسی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ امریکی معاشرے کا انحطاط کم و بیش پندرہ سال قبل شروع ہوا تھا۔ تب سے اب تک بہت کچھ بدل اور بگڑ چکا ہے مگر کوئی نہیں جو اس طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا میں اس وقت جو خرابیاں پائی جارہی ہیں، وہ سب کی سب ڈونلڈ ٹرمپ کی پیدا کردہ نہیں تاہم وہ معاملات کو درست کرنے کے بجائے، اُن سے اپنے لیے فوائد کشید کررہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بگاڑ کا دائرہ مزید وسعت اختیار کرے۔

امریکا میں قوم کے لیے سوچنے کا رجحان دم توڑ جارہا ہے۔ لوگ صرف انفرادی کامیابی اور خوشحالی کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ ملک چاہے کسی بھی سمت جارہا ہو، وہ صرف اپنا بھلا چاہتے ہیں، اپنی یعنی انفرادی کامیابی ہر حال میں یقینی بنانا چاہتے ہیں۔

امریکا کی نجی محفلوں میں غیر معمولی تعلیم یافتہ اور دُنیوی اعتبار سے انتہائی کامیاب افراد معاشرے کے بنیادی مسائل کے بارے میں گفتگو سے گریز کرتے ہیں۔ کسی کو اس بات سے کچھ بھی غرض نہیں کہ معاشرہ بہتر ہونا چاہیے، سب کو ڈھنگ سے جینے کا موقع ملنا چاہیے۔ ایسی نجی محفلوں میں لوگ صرف اپنی ذات کا، اپنے مفادات کو لاحق خطرات کا رونا رو رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہے آج کا امریکا۔ معاشرے اور ریاستی نظام کو درپیش سنگین مسائل کے بارے میں بحث و تمحیص کے بجائے لوگ فلموں اور ایسے ہی دوسرے موضوعات پر بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ہے امریکی معاشرے کی سچائی۔

ایک بڑا ٹرننگ پوائنٹ

میرے نزدیک تو یہ ایک بڑا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امریکا میں بہت سے اہلِ علم، اہلِ کمال انتہائی نوعیت کی بیزاری محسوس کررہے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ امریکا میں میرے قیام کی مدت بھی اب پوری ہوا چاہتی ہے۔ جب کسی معاشرے سے لبرل اشرافیہ نکلنے لگتی ہے اور اہلِ کمال جان بچاکر بھاگنے کی سوچنے لگتے ہیں تب پورے معاشرے کو اِس کی بہت بھاری قیمت چُکانا پڑتی ہے۔ اب امریکا کو بھی ممکنہ طور پر اس مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ پہلے تو امریکا نے دنیا بھر سے بہترین ذہن اپنی طرف متوجہ کیے اور اب وہ فطری علوم وفنون اور دیگر شعبوں میں پیشرفت کی راہیں خود ہی مسدود کررہا ہے۔ امریکا میں ڈھائی عشروں سے یہی کچھ ہورہا ہے۔ جو آزادی کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں، وہ امریکا سے نکلنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ جنہیں فطری علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں زیادہ وسیع البنیاد تحقیق کرنی ہے، وہ یورپ یا کہیں اور منتقل ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔

ڈیموکریٹس نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری

بل کلنٹن اور براک اوباما ڈیموکریٹ صدور تھے۔ اِن دونوں کے ادوارِ صدارت کے دوران امریکا میں ٹیکس کی پالیسی بہت اچھی تھی۔ معیشت مستحکم ہوئی۔ اِن دونوں نے جس انداز سے حکومت کی، اُسے دیکھ کر لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ امریکا میں ری پبلکنز کے برسرِ اقتدار آنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہونی چاہیے۔ بل کلنٹن اور براک اوباما نے بلند آمدنی والوں کے مفادات کو محفوظ کرنے کے حوالے سے پہلے ہی بہت کچھ کردیا تھا تو پھر اُنہیں کیا ضرورت پڑی کہ ڈیموکریٹس کو ناکام بناکر ری پبلکنز کو اقتدار میں لائیں؟

ڈیموکریٹس سے ایک بنیادی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اُنہوں نے شناخت کی سیاست پر بہت زیادہ توجہ دی۔ امریکا کے محنت کش طبقے کی آمدنی بڑھانے اور اُسے معیاری انداز سے جینے کا موقع دینے پر توجہ دینے کے بجائے ڈیموکریٹس یہ سمجھتے رہے کہ اپنی شناخت قائم رکھ لینا بھی کافی ہے۔ لوگ اِس غلطی سے بچھر گئے۔ اِس ایک غلطی نے امریکا میں بلو کالر جاب کرنے والوں کو ری پبلکنز کے ہاتھ میں دے دیا۔ ٹرمپ نے چکنی چُپڑی باتیں کرکے اُنہیں شیشے میں اُتار لیا۔

بنیادی سبق

امریکا بہت تیزی سے انحطاط کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔ ایسا اِس لیے ہوا ہے کہ اُس نے خطرناک علامات کو نظرانداز کرنے کی غلطی کی ہے۔ دنیا بھر میں مضبوط ترین ممالک ایسی ہی حالت میں زوال کی طرف گئے ہیں۔ چشمِ فلک نے بیسیوں ممالک کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھا ہے۔ جب بھی کوئی ملک بہت زیادہ ترقی حاصل کرلیتا ہے تو اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے اور اپنی طاقت ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

رونالڈ ریگن کے ادوارِ صدارت میں امریکا خاصے شورش زدہ ماحول سے دوچار رہا۔ اگر کسی نے کہا ہوتا کہ ہم ریگن کے زمانے کو امنِ عامہ اور تعقل کی اثر پذیری کے حوالے سے محض یاد نہیں کریں گے بلکہ اُس دور کو یاد کرکے سکون بھی محسوس کریں گے تو لوگ اُسے پاگل قرار دیتے۔ اب ذرا سوچیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ امریکا میں اِس وقت قانون کی علم داری سے جو کھلواڑ کیا جارہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے کیا ریگن کا زمانہ بہت اچھا دکھائی نہیں دیتا؟

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"On the origins of the continuous deterioration of the U.S.: A personal reflection". ("The Globalist". June 13, 2025)

یوکرین کا روس پر خوفناک حملہ

یورپ خطّے کو جنگ میں جھونک رہا ہے!

ماہر علی

۱۹۱۴ء کے برعکس، یورپ آج حادثاتی طور پر جنگ کی جانب نہیں جا رہا ہے۔ وہ پورے ہوش و حواس میں ایسی جنگ کی تیاری کر رہا ہے جو اسے پُرکشش لگ رہی ہے جبکہ اس میں یورپ کی توجہ کا محور روس اور یوکرین کی دشمنی ہے جہاں یوکرین نے حال ہی میں اپنے دشمن کی فضائی صلاحیتوں کو نقصان پہنچانے کے مقصد سے ڈرونز کا طاقتور حملہ کیا ہے۔

ولادیمیر زیلنسکی نے دعویٰ کیا کہ آپریشن اسپائیڈر ویب میں کم از کم ۴ روسی فضائی اڈوں پر ۴۰ سے زائد اسٹریٹیجک بمباروں کو تباہ کیا گیا یا نقصان پہنچایا گیا۔ اس حملے کی منصوبہ بندی ۱۸/ماہ سے زائد عرصے میں کی گئی تھی۔ بظاہر لاری ڈرائیورز جن کا خیال تھا کہ وہ لکڑی کے کیبن کی ترسیل کر رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ چھپے ہوئے ڈرون کو اپنے اہداف کے قریب لے جا رہے تھے۔ روس نے 'دہشتگرد' حملے کی تصدیق کی ہے لیکن اس نے ممکنہ نقصانات کی وضاحت نہیں کی ہے (بالکل اسی طرح جس طرح گزشتہ ماہ پاک۔ بھارت غیر اعلانیہ تصادم میں ہوا تھا)۔

تاہم اس بات کا کم ہی امکان ہے کہ کیف کی یہ حکمت عملی فریقین کو پُرامن حل کی جانب لے جائے گی۔ یوکرین نے حملہ ایک ایسے وقت میں کیا کہ جب روس کی جانب سے یوکرین پر سب سے بڑا ڈرون اور میزائل حملہ کیا گیا تھا۔ روس کے اس بڑے حملے میں بھی کم ہلاکتیں ہوئیں جبکہ غزہ میں اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں زیادہ شہادتیں ہوتی ہیں۔

مجموعی طور پر اس یورپی جنگ میں، قابلِ مذمت اور وسیع پیمانے پر یک طرفہ مشرق وسطیٰ کے تنازع سے کئی گنا زیادہ جانوں کا ضیاع ہوا ہے۔ دونوں معاملات میں واضح سوال یہی ہونا چاہیے کہ جنگ کو کیسے روکا جاسکتا ہے اور پُرامن منصفانہ حل کیسے نکالا جاسکتا ہے۔ یورپ کے لیے یہ صدمہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی انتظامیہ ایک ایسے امن معاہدے پر غور کر رہی ہے جس سے ولادیمیر پیوٹن کو زیادہ تر وہ زمین مل جائے گی جو روس نے جنگ کے دوران حاصل کی تھی۔

یہ یوکرین کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہوگی جو کہ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اپنی سرحدوں کو برقرار رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یوکرین پر تنازع، سوویت یونین سے بھی کافی پرانا ہے اور پیوٹن نے اپنے نظریے کی تائید کے لیے تاریخ کے کچھ حصوں کا انتخاب کرلیا ہے اور ایک ایسے بیانیے کو تخلیق کیا ہے جو آج کی ۲۱ویں صدی کی دنیا کے کام کرنے کے طریقے سے بالکل مختلف ہے۔

یہی تنقید ہم ولادیمیر پیوٹن کے حریفوں پر بھی کرسکتے ہیں جو ایک ایسی تنظیم میں شامل ہیں جسے اعتماد نہیں کہ وہ اپنے امریکی سرپرست سے کس طرح کی حمایت حاصل کریں گے۔ اپنے گزشتہ دورِ صدارت میں ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکا کے نیٹو سے نکلنے کی دھمکی دی تھی۔ اس بار انہوں نے یہ انتباہ تو نہیں دہرایا لیکن وہ اتحادیوں کو فوجی تیاریوں پر وسائل خرچ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے بہت سے اتحادی ہتھیاروں پر دولت خرچ کرنے کے لیے تیار بھی ہیں۔

یورپ کے مغربی ساحل پر واقع ایک جزیرہ برطانیہ 'جنگ کی تیاری' کے لیے ہتھیاروں پر اربوں ڈالرز کی سرمایہ کاری کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے سیکرٹری دفاع کے مطابق، برطانیہ کا مؤقف ماسکو کے ساتھ ساتھ بیجنگ، تہران اور پیانگ یانگ کو بھی 'ایک مضبوط پیغام بھیجے گا'۔ لیکن شاید ہمیں ایک ایسے ملک سے محتاط رہنا چاہیے جس ملک نے اعلیٰ اقدار کے لیے کھڑے ہونے کا دعویٰ کیا لیکن اس نے خلیجی و دیگر مقامات سے روسی ارب پتی اور مشکوک سرمایہ کاروں سے ملنے والی رقم کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔

بہت سی دیگر یورپی اقوام بھی اسی زمرے میں آتی ہیں یعنی وہ بھی امریکا کی خوشنودی کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ امریکا اکثر ایسی کوششوں کو نظر انداز کردیتا ہے جس میں لگژری جیٹ جیسی چمکدار یا مہنگی چیز شامل نہ ہو۔ ممالک کا ایک چھوٹا گروپ مخالف سمت میں جا رہا ہے، یعنی وہ روس کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہنگری کے رہنما وکٹر اوربان نے یہ مضحکہ خیز دعویٰ کیا ہے کہ امریکی صدر (اگرچہ وہ جھوٹ بولتے ہیں) لوگوں سے سچ اگلوانے والے ایک 'سچ سیرم' کی طرح ہیں۔ سلوواکیہ کے رہنما رابرٹ فیکو بھی اسی طرح کے خیالات رکھتے ہیں۔ اگرچہ اٹلی کی وزیراعظم جارجیا میلونی جن کا ماضی انتہائی دائیں بازو کی جماعت سے وابستہ ہے لیکن وہ پیوٹن کی کھلے عام حمایت نہ کرتے ہوئے بھی یورپی رہنماؤں اور ٹرمپ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتی ہیں۔

لیکن پرتگال سے پولینڈ تک، انتہائی دائیں بازو کی سیاسی جماعتیں واشنگٹن کی نئی انتظامیہ کی حمایت میں پھل پھول رہی ہیں۔ گزشتہ ماہ پرتگالی چیگا پارٹی اپنی آمریت کا تختہ الٹنے کے ۵۰ سال بعد لزبن میں مرکزی اپوزیشن کے طور پر ابھری ہے جبکہ رواں ہفتے پولینڈ میں کیرول ناوروکی نے ٹرمپ کی 'میک امریکا گریٹ اگین' تحریک کے پرچار کے بعد وارسا کے میئر رافال ٹرزاسکوسکی کو ان کی کرسی سے برطرف کردیا۔

اس کے علاوہ سنگاپور میں ہونے والے شنگریلا ڈائیلاگ میں ٹرمپ کے سیکرٹری دفاع پیٹ ہیگسیتھ نے امریکا کے ایشیا پیسیفک اتحادیوں کو چین کی جانب سے لاحق خطرے کے پیش نظر فوجی اخراجات میں اضافہ نہ کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا جس کے کچھ ہی دیر بعد، جرمن دفاعی سربراہ کارسٹن بریور نے اعلان کیا کہ نیٹو کے ارکان کو آئندہ ۴ سال میں روس کے حملے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ چند روز قبل جرمن چانسلر فریڈرک مرز نے دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی بار جرمن فوجیوں کو مستقل طور پر بیرون ملک تعینات کرنے کے موقع پر لتھوانیا کا دورہ کیا۔

اس طرح کے ہتھکنڈوں سے ماسکو کو جو پیغام ملتا ہے اس کا تصور کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک مکمل جنگ روس اور یورپ دونوں کے لیے خوفناک ثابت ہوگی۔ لیکن اس سوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کیا پیوٹن کی ضد اور یورپ کی جارحانہ فوجی چالیں اس جنگ کا باعث بن سکتی ہیں جس کا ہر ایک کو خوف ہے؟

یورپ کو ٹرمپ اور ان کے منشیوں پر بھروسا کرنے کے بجائے مؤثر سفارت کاری پر توجہ دینی چاہیے تاکہ ایک بڑے عالمی تنازع سے بچا جاسکے۔ ایسی جنگ جو حقیقتاً جیتی نہیں جاسکتی، اس کے لیے تیار ہونے اور رقم خرچ کرنے کے بجائے یورپ کو اپنے محدود وسائل کو اندرونِ خانہ سماجی و معاشی مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

"Junker mentality".

(Daily "Dawn" Karachi. June 4, 2025)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950